غلام رسول مہر
مالک رام
عبادت بریلوی
مختارالدین احمد
جگن ناتھ آزاد
عطا کاکوی

۵۰ نئے پیسے

غالب نمبر

فروری ۱۹۵۸ء
ماگھ - پھالگن شک سمت ۱۸۷۹

آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل" آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا۔ کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اُردو کے محسن ہیں۔

(عبدالمجید سالک)

"آج کل" ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

"آج کل" کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔

(نیاز فتحپوری)

میں "آج کل" کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

(فراق گورکھپوری)

"آج کل" کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نخز پُر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

(اثر لکھنوی)

"آج کل" اردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

"آج کل" کے نئے ہیں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔ (احتشام حسین)

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق:۔ غالب نامہ آور دم نام و نشانم مپرس

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ چھ روپے | پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں ۵۰ نئے پیسے | پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۶ — نمبر ۷

فروری ۱۹۵۸ء

ماگھ پھالگن شک سمت ۱۸۷۹

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

غالب

ہم ہر سال فروری میں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور سیکڑوں غالب داں سال بہ سال بلکہ ماہ بہ ماہ اس کے سوانح اور کلام پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غالب کی شوخی اور بانکپن اس کی انفرادیت اور تفکر، اس کی معنیٰ آفرینی اور حسنِ ادا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ہمارے خیال میں غالب کی اولوالعزمی خودداری اور پامردی کا کماحقہٗ مطالعہ نہیں ہو سکا ہے۔ غالب کی زندگی ایک جہدِ مسلسل رہی ہے۔ جب وہ پانچ برس کے تھے تو یتیم ہو گئے۔ چچا نے جن سے (نواب احمد بخش والیٔ لوہارو کی ہمشیرہ منسوب تھیں مرزا نوشہ اور مرزا یوسف کی پرورش اپنے ذمہ لی۔ غالب آٹھ برس کے ہوئے تو چچا کا انتقال ہو گیا۔ انگریزی سرکار نے چچا کی جایداد لے لی اور والیٔ لوہارو کی پچیس ہزار سالانہ کی مالگذاری معاف کر دی تاکہ اس سے غالب اور ان کے بھائی کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملتا رہے۔ چند مہینوں بعد نواب احمد بخش نے کچھ ایسا داؤ کیا کہ انگریزی حکام نے یہ رقم گھٹا کر ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ کر دی یعنی غالب کو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ کی یافت رہ گئی۔

تیرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ غالب جب تک آگرے میں رہے دیگر رؤسا کی طرح وہ بھی لہو و لعب اور رنگ رلیوں میں مشغول رہے۔ پچیس برس کے سن تک یہ شوق قایم رہا پھر طبیعت اعتدال پر آ گئی البتہ شراب کی لت اور جوئے کا چسکا پڑ چکا تھا۔

شادی کے بعد مرزا غالب آگرے سے دلی آ گئے اور ان کی مالی اور ذہنی پریشانیوں کا دور شروع ہوا۔ ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش خاں نے اپنی حیات ہی میں جایداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ غالب کی رقم اُن کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں سے متعلق تھی جو غالب سے خوش نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے تو روپیہ ادا کرنے میں بڑے روڑے اٹکائے اور آخر ۱۸۳۱ء میں روپیہ بھیجنا بالکل بند کر دیا۔ خدا کی کرنی کہ ۱۸۳۵ء میں شمس الدین خاں کو ایک انگریز افسر فریزر کے قتل کرانے کے الزام میں پھانسی ہو گئی اور ۱۸۳۷ء میں غالب کو چار برس کا بقایا بھی وصول ہو گیا۔ مگر اس دوران میں جوان بھائی مرزا یوسف مصیبتوں سے عاجز آ کر دیوانہ ہو گیا۔

غالب نے ایک بار پھر کوشش کی کہ ان کی آمدنی دس ہزار سالانہ ہو جائے چنانچہ اس زمانے میں دلی سے کلکتہ کا سفر کیا۔ کلکتے کی عدالت نے کہا کہ یہ مقدمہ دلی کی عدالت میں دائر ہونا چاہیئے چنانچہ غالب تین برس بعد کلکتے سے دلی واپس آ گئے۔ آخر جون ۱۸۳۶ء میں مقدمہ غالب

کے خلاف فیصلہ ہوا۔ گورنر جنرل سے اپیل کی۔ فیصلہ خلاف رہا۔ ولایت میں اپیل کی۔ ۱۸۴۲ء میں وہاں سے بھی خلاف فیصلہ آگیا اس کے باوجود ہمت نہ ہاری اور نہ کوشش ترک کی۔ ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ۱۸۴۴ء میں وہاں سے دامنِ مراد پُر نہ ہوا۔

۱۸۵۰ء سے غالب کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جبکہ انھوں نے بیوی کے طعنوں سے عاجز آکر نوکری کی ذلت برداشت کرنا قبول کی۔ قلعہ میں سلسلہ جنبانی ہوئی اور بہادر شاہ ظفر نے ان کو فارسی میں خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار تھی۔ ۱۸۵۴ء میں ولی عہد بہادر مرزا فخرو شاگرد ہوئے اور استاد کو چار سو روپیہ سالانہ دینے لگے ادھر واجد علی شاہ نے بھی پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ غالب کے دن پھر گئے۔ لیکن تو یہ کہیے غالب کی قسمت میں فراغت کہاں۔ دو برس بعد مرزا فخرو کا انتقال ہوگیا۔ واجد علی شاہ تخت سے اُتار دیے گئے۔ خضر سلطان کو میجر ہڈسن نے گولی مار دی۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا اور بے تاج ظفر رنگون سدھارے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی غالب کی بیوی نے اپنا تمام زیور میاں کالے صاحب کے مکان پر بھیج دیا کہ وہاں محفوظ رہے گا۔ وہ سب لٹ گیا۔ دیوانہ بھائی مرزا یوسف بھی مرگیا۔ پنشن تو بند ہونا ہی تھی اور یہی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ مرزا غالب نے اگر انگریزوں کی مخالفت نہیں کی تو ان کی حمایت بھی نہیں کی، بلکہ ان پر باقاعدہ الزام لگا کر "ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔"

نواب رام پور نے ۱۸۵۷ء سے ہی بلانا شروع کر دیا تھا آخر غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور چلے گئے۔

۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں کی تاجپوشی کا جشن تھا۔ غالب رام پور گئے۔ دلی واپس آرہے تھے، مراد آباد کے پاس راستہ میں کشتیوں کا پل پڑتا تھا جیسے ہی غالب کی پالکی اس پار لگی، پل بہہ گیا۔ ملازم اور زادِ راہ اس پار رہ گئے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ غالب نے مراد آباد کی سرائے میں رات بسر کی۔ دوسرے دن شہر کے شرفا اُٹھا لے گئے۔ جاڑا، بڑھاپا اور کمزوری۔ آخر بیمار ہوگئے اس کے بعد برابر صحت گرتی گئی۔ دوسرے سال اپنی بیماری کے حال میں لکھتے ہیں،

"اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اُٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بنتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔۔۔۔۔۔"

ایک سو ساٹھ روپیہ کی آمد۔ تین سو روپیہ کا خرچ۔ کہو زندگی دشوار ہے کہ نہیں۔"

اس دشوار زندگی کے باوجود غالب کی یہ انانیت قائم رہی کہ چاہے یار دروازہ ہو یا دیر کعبہ خاص کر نہ ہارے رہ گئے۔ محبت میں پاسِ وضع کا ہمیشہ خیال رہا۔ دلی کالج میں نوکری کے لیے گئے اور پرنسپل نے باہر نکل کر استقبال نہ کیا تو واپس چلے آئے۔ وظیفہ کی طلب میں یہ تگ و دو اس لئے نہ تھی کہ وہ روپیہ کے لالچی تھے اور اس کے لئے انگریزوں کی خوشامد پر تیار تھے بلکہ اس لئے کہ یہ اُن کی جائداد کا روپیہ تھا اور وہ اپنے حق کے لئے لڑ رہے تھے ——

غالب کی خودی، خودداری اور اُن کی مسلسل جد و جہد ایک روشن مثال ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی

دسمبر ۱۹۵۷ء میں قوم اور قلم کے پجاریوں کو تین سانحے پیش آئے۔ شیخ الہند مولانا سید حسین احمد مدنی کی وفات۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مؤلف تاریخ ادب اردو اور پنڈت ہری چند اختر کا انتقال۔

وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بیان میں یاد دلایا کہ مولانا مدنی بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ مدینہ چلے گئے تھے اور وہیں فارغ التحصیل ہوکر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ پہلی جنگ عظیم کے ایام میں جبکہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی حجاز تشریف لے گئے تو مولانا مدنی اُن کے شاگرد ہوگئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ ان دونوں کی انگریز دشمنی مشہور تھی۔ چنانچہ حجاز کے شریف حسین نے دونوں کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کر دیا جنھوں نے انھیں مالٹا میں قید کر دیا۔ جنگ کے خاتمے پر مولانا محمود الحسن اور مولانا مدنی کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت مل گئی چنانچہ وہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان آگئے۔ اس وقت سے اب تک یعنی ۳۷ برس تک مولانا اس جماعت میں شریک رہے جس کا نصب العین ہند کو پنجۂ فرنگ سے آزاد کرانا تھا جب بھی کانگریس نے ملک کو قید و بند جھیلنے کی دعوت دی مولانا نے اس پر لبیک کہا۔ ۱۹۴۷ء میں جبکہ مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ نعروں نے بہت سے مسلمانوں کو متزلزل کر دیا اس وقت بھی مولانا مدنی ایک پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے اور اپنے عزمِ مستحکم سے دوسروں کا دل بڑھاتے رہے۔

وزیر اعظم نے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ ان کی موت ایک ایسے عالم اور وطن پرست کی موت ہے جس نے ہند کی جد و جہد آزادی میں ہماری رہنمائی کی۔

مولانا کے خیال میں ملت وطن سے الگ نہیں تھی۔ انھیں یقین تھا کہ ہند کے مسلمان اپنے عقاید کی پوری پوری پابندی کے ساتھ ہند کے وفادار اور وطن پرست شہری بن سکتے ہیں۔

ابھی دو برس بھی نہیں ہوئے کہ حکومت ہند مولانا مدنی کو ایک اعزاز عطا کرنا چاہتی تھی لیکن مولانا نے یہ کہہ کر اعزاز لینے سے معذرت کر دی کہ میں نے ملک و قوم کی جو خدمت کی ہے اس کا کوئی انعام لینا میرا ضمیر نہیں گوارا کر سکتا۔ اُن کے لئے سب سے بڑا انعام یہی تھا کہ ان کا پیارا ملک اُن کی زندگی میں ہی آزاد ہو گیا تھا۔

ہری چند اختر

دسمبر کا مہینہ ختم ہوتے ہوتے ایک داغ اور دے گیا۔

ہری چند اختر جو آدمیوں میں ہیرا اور شاعروں میں تارا تھا ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ اختر کے ذکر کے ساتھ ہی سنجیدہ محفلوں میں تبسم کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ شاید اختر کی سب سے نمایاں صفت اس کی خوش مزاجی، بذلہ سنجی، ذہانت اور حاضر جوابی تھی۔ وہ روتوں کو ہنسانے اور سوتوں کو جگانے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اختر کی ذہانت و ظرافت اس کی علمیت پر پردہ ڈالے رہتی تھی۔ لیکن جب وہ بحث و مباحثہ اور شعر خوانی پر آتا تو لوگوں کو معلوم ہوتا کہ یہ شخص کتنا وسیع العلم ہے۔ اختر کی تیسری صفت اس کی عالی ظرفی اور خودداری تھی۔ چاہے جو کچھ بیت جائے کبھی کسی سے نہ تو شکایت کی اور نہ اپنے لئے کوئی چیز مانگی۔ ہاں دوسروں کو جن میں دوست دشمن سبھی شامل تھے ہمیشہ دامے درمے سخنے مدد کی۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ مخلص اختر تھا لیکن علم و ادب کے آسمان پر خورشید وار چمکے۔ زندگی بھر مصائب اور ناکامیوں کا سامنا رہا لیکن یہ مرد مجاہد ان منزلوں سے ہنستا ہوا گزر گیا۔ سینے میں ناسور چھپائے محفلوں کو گرماتا رہا اور بذلہ سنجی کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہا۔ فارسی میں منتہی تھے۔ ہر رنگ اور ہر نوعیت کے اشعار یاد تھے۔ اللہ ان کی روح کو سکون دائمی عطا کرے۔ ان کی شخصیت اور کمالات ادب پر مفصل مضمون آئندہ شمارے میں شائع ہوگا۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا اردو زبان و ادب پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جس نے انگریزی زبان میں اردو ادب کی جامع اور مفصل تاریخ لکھی۔ اگرچہ ان کی عمر مختلف انتظامی عہدے سرانجام دینے میں گذری لیکن ان کا دل ملازمت سرکار میں نہیں بلکہ خدمتِ ادب میں لگا رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد جب کہ لوگ گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور بھی لگن سے خدمتِ ادب میں لگ گئے اور انھوں نے مثنوی میر بخط میر شائع کر کے اردو پر ایک اور احسان کیا۔ موصوف ساہتیہ اکادمی کے ممبر بھی تھے حق مغفرت کرے۔

ڈاکٹر سید احمد بریلوی

اُردو کے مشہور صحافی، ادیب اور شاعر جناب سید بریلوی کا کراچی میں ۲۳ دسمبر ۱۹۵۷ء کو انتقال ہو گیا۔ مرحوم مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے تھے۔ بڑے مخلص انسان تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی یورپ سے واپسی

مقامِ مسرت ہے کہ ادارۂ آج کل کے رکن ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ایک سال چار ماہ کے بعد یورپ سے واپس تشریف لے آئے ہیں۔ "انیسویں صدی میں ہندستانی معاشرت" کے موضوع پر اردو اور فارسی مخطوطات کی بنیاد پر تحقیقی کام کرنے کے لئے یورپ گئے تھے۔ آپ کی آمد پر دلّی کے ادبی حلقوں نے آپ کا خیر مقدم کیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے آپ کا تحقیقی کام بتدریج منظرِ عام پر آ جائے گا۔

مشرقی اُتر پردیش میں غذائی کمی

ادھر مشرقی اتر پردیش سے تشویش ناک خبریں آ رہی ہیں کہ وہاں سوکھا پڑ گیا۔ ہند کے دوسرے علاقوں میں بھی سوکھا پڑنے سے فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ایسے موقعوں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے۔ اوّل تو سرکار فوری انتظام کرتی ہے۔ سستے غلے کی دکانیں کھولتی ہے، مفت غذا اور کپڑے تقسیم کرتی ہے، لگان معاف کرتی ہے اور تقاوی تقسیم کرتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم سوکھے اور سیلاب کا ایک مستقل حل ہے، اور وہ ہے دریاؤں پر باندھ تعمیر کرنا اور ان سے آبپاشی اور بجلی حاصل کرنا۔ چنانچہ مشرقی اتر پردیش میں ضلع مرزا پور کی دودھی تحصیل میں پپری کے مقام ریہاند باندھ تعمیر ہو رہا ہے جو ۱۹۶۱ء تک تیار ہو جائے گا۔ اس کے مکمل ہونے پر مشرقی اتر پردیش میں مزید ۱۴ لاکھ ایکڑ علاقے کی سینچائی ہو سکے گی جس سے دو لاکھ ٹن مزید خوراک مل سکے گی۔ بہار میں ۵ لاکھ ایکڑ کی سینچائی ہو سکے گی اور تقریباً ایک لاکھ ٹن مزید غلہ پیدا ہو سکے گا اس کے علاوہ سون ندی میں سیلاب کی روک تھام ہو جائے گی۔ باندھ کے بجلی گھر سے تین لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی جس کی مدد سے اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش میں صنعتی ترقی کا باب کھل جائے گا۔ ریہاند باندھ مشرقی اتر پردیش کے روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

عطا کاکوی

نذرِ غالب

واقفِ رازِ حقیقت تھی نگاہِ غالب
رشکِ صد زہد تھا اندازِ گناہِ غالب
کچھ عجب رنگ کی تھی شام و پگاہِ غالب
مختصر یہ کہ جدا سب سے تھی راہِ غالب

اس کا آہنگ جدا، لحن جدا، ساز جدا
فکر کا ڈھنگ جدا، کہنے کا انداز جدا

اللہ اللہ رے تری شمعِ سخن کی تنویر
سارے اسرار ترے دامِ تخیل میں اسیر
مملکت دل کی ہوئی تیرے قلم کی جاگیر
ہوئی ہم دوشِ فلک قصرِ سخن کی تعمیر

تیرا اندازِ سخن حسن فزا کیا کہنا
ماہر و یانِ معانی کی ادا کیا کہنا

نغمۂ شادی بھی ہے لے میں تری اور غم بھی
سادگی بھی ترے اشعار میں پیچ و خم بھی
ایک ہی جام میں امرت بھی گھلا ہے سم بھی
کچھ تری بزم میں محرم بھی ہیں نا محرم بھی

گو نہ سمجھیں ترے اشعار مگر سنتے ہیں
جو سمجھ لیتے ہیں وہ وجد میں سر دھنتے ہیں

اللہ اللہ رے تری فکرِ سخن کا اعجاز
تیرے مضراب سے بجنے لگا تکوین کا ساز
جلوۂ حسنِ حقیقت بہ لبِ بامِ مجاز
کر دیا فاش سراپردۂ تخلیق کا راز

"دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں"

کاکلِ رنج و الم اور پریشاں ہوتی
زندگی اپنی مصائب سے گریزاں ہوتی
شدتِ یاس میں کیا حالتِ انساں ہوتی
تو نہ بتلاتا تو مشکل کبھی آساں ہوتی

"عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

کروٹیں لیتا ہے جب پیرِ فلک لاکھوں سال
پیدا ہوتا ہے کہیں دہر میں تب مردِ کمال
صرف ہو جاتی ہے مدت پئے تکمیلِ جمال
پھر ہو غالب کوئی مشکل ہے بہ قولِ اقبال

"حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا"

غلام رسول مہر

پنج آہنگ

پنج آہنگ میرزا غالب کے کلیاتِ نثرِ فارسی کی پہلی کتاب ہے جو پانچ حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ اوّل مکتوب نگاری کے القاب و آداب، حصّہ دوم فارسی زبان کے مصادر، اصطلاحات اور لُغات۔ حصّہ سوم میرزا غالب کے دیوان سے منتخب اشعار جنہیں مختلف مطالب کے لئے مکاتیب میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حصّہ چہارم مختلف کتابوں کے مقدمے یا تقریظیں اور عام نثریں، حصّہ پنجم میرزا کے فارسی مکاتیب۔

اس کتاب کے ابتدائی تین آہنگوں یا حصّوں کا آغاز ۱۸۲۵ء میں ہوا تھا۔ جب انگریزوں نے بھرت پور کے خلاف یورش کی تھی اور اس یورش میں نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ کی فوج بھی شامل تھی۔ میرزا غالب اور ان کے برادرِ نسبتی میرزا علی بخش خاں بھی نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور گئے تھے۔ معلوم ہے کہ میرزا کو عسکری معاملات سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اغلب ہے وہ اس زمانے میں فیروز پور جھرکہ گئے ہوں اور میرزا علی بخش کے اصرار پر محض سیر و تفریح کے خیال سے معیت اختیار کر لی ہو یا آگرہ جانا چاہتے ہوں اور فوج کے ساتھ بھرت پور چلے گئے۔ پھر آگرہ ہوتے ہوئے دہلی آئے۔

بھرت پور پر دو یورشیں

میرزا نے پنج آہنگ کے دیباچے میں اسے سنہ ۱۲۴۱ھ (۱۶ اگست ۱۸۲۵ء — ۵ اگست ۱۸۲۶ء) کا واقعہ قرار دیا ہے۔ ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے خلاف انگریزوں نے دو مرتبہ یورش کی، پہلی مرتبہ سر ڈیوڈ آکٹرلونی (جنہیں ہندوستانی لونی اختر کہتے تھے) کے زیرِ اہتمام ماہ مئی میں۔ اس یورش کو لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل نے منسوخ کر دیا۔ آکٹرلونی استعفیٰ دے کر میرٹھ پہنچ گیا اور وہیں تھوڑی دیر بعد اس نے وفات پائی۔ چارلس مٹکاف کے زیرِ اہتمام دسمبر ۱۸۲۵ء میں دوبارہ یورش کی گئی اور ۱۶ جنوری ۱۸۲۶ء کو بھرت پور کا فیصلہ ہو گیا۔ اس یورش کا سالار کامبرمیر تھا۔ میرزا غالب کے بیان سے واضح ہے کہ وہ پہلی یورش میں نہیں بلکہ دوسری یورش میں فوج کے ساتھ گئے تھے اس لئے کہ پہلی یورش ۱۲۴۰ھ میں ہو چکی تھی۔

پہلے تین حصّے

میرزا فرماتے ہیں کہ اس یورش میں میرزا علی بخش خاں اور میں ہم سفر تھے۔ رات ایک خیمے میں گزارتے تھے۔ علی بخش خاں نے فرمائش کی کہ مکتوب نگاروں کے لئے ایک ایسا دستور العمل تیار کر دیا جائے جس میں متعارف القاب و آداب درج ہوں۔ ساتھ ساتھ مضامین مکاتیب کی مناسبت کے مطابق شکریہ و شکوہ اور شادی و غم کے متعلق موزوں فقرات لکھ دئے جائیں۔

اگرچہ میرزا کی طبیعت اور روش کو اس فرمائش سے چنداں مناسبت نہ تھی لیکن علی بخش خاں کے پاسِ خاطر سے وہ اسے پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور تین روز میں آہنگِ اوّل پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ دوسرے اور تیسرے آہنگ کی ترتیب میں بھی زیادہ وقت صرف نہ ہوا ہوگا۔ آہنگِ سوم میں میرزا نے چنے ہوئے اشعار پر جو عنوان لکھ دئے ہیں ان سے اشعار کے مطالب و معانی کا زیادہ سے زیادہ صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ترتیبِ کتاب میں رخنہ

تسخیرِ بھرت پور کے بعد کتاب کی ترتیب رُک گئی۔ میرزا غالب کو خاندانی پنشن کے متعلق چارہ جوئی کے لئے کلکتہ جانا پڑا۔ نواب احمد بخش خاں ریاست

کاکاروبار اپنے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر کے قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے، اور ۱۸۲۷ء میں واصل بحق ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں اور خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان شدید تنازعات کا آغاز ہوا۔ میرزا علی بخش خاں دہلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ پہلے لکھنؤ، پھر جے پور چلے گئے۔ لیکن اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ یہ مدت ناکامی میں بسر کی۔

۲۲۔ مارچ ۱۸۳۵ء کو دہلی کا انگریز ریزیڈنٹ ولیم فریزر مارا گیا۔ اس قتل کے الزام میں نواب شمس الدین احمد خاں بھی ماخوذ ہوئے اور انھیں ۸۔ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

تکمیلِ ترتیب

یہ ہنگامہ ہو چکا تو علی بخش جے پور سے دہلی پہنچے۔ اس زمانے میں میرزا غالب کا فارسی دیوان "میخانۂ آرزو" کے نام سے مرتب ہو چکا تھا۔ اور میرزا نے اس کے آغاز و اختتام کی نثریں بھی لکھ دی تھیں جو اب مطبوعہ فارسی کلیاتِ نظم میں موجود ہیں۔ علی بخش خاں نے یہ نثریں میرزا سے پڑھیں۔ پھر انھیں خیال پیدا ہوا کہ میرزا کی تمام فارسی نثریں جمع کر لینی چاہئیں۔ حکیم رضی الدین حسن خاں بھی اس ضروری کام کو کمل کر دینے کی تحریک فرماتے رہے۔ میر محمد حسین خاں نثر خوانی میں علی بخش خاں کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ انھوں نے بھی نثروں کی فراہمی پر زور دیا۔ علی بخش خاں کو یہ خیال بھی رہا کہ میرزا غالب کی فارسی تحریرات جمع ہو جائیں گی تو غلام فخر الدین خاں (ابن علی بخش خاں) ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ یوں کتاب کی ترتیب از سرِ نو شروع ہو گئی۔

دو چھاپے

غرض آہستہ آہستہ متفرق نثریں جمع ہوئیں۔ جن سے آہنگ چہارم تیار ہوا۔ میرزا کے چھتے فارسی مکاتیب کی نقلیں مہیا ہو سکیں انھیں آہنگ پنج میں رکھ دیا گیا۔ اس طرح زیادہ تر علی بخش خاں کی فرمائش اور کوشش سے اس کتاب کی تدوین کا سر و سامان ہوا جس سے ہم بنام "پنج آہنگ" متعارف ہیں۔ لیکن تدوین کے بعد بھی کم و بیش بارہ تیرہ سال تک اس کی طباعت و اشاعت کا بندوبست نہ ہو سکا۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۔ رمضان ۱۲۶۵ھ (۲۔ اگست ۱۸۴۹ء) کو قلعۂ معلیٰ کے مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے چار سو ترانوے صفحے تھے اور چار روپے قیمت رکھی گئی تھی۔ تصحیح و طباعت کا ذمہ عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں نے اٹھایا تھا۔ اس اشاعت کے کسی نسخے کا اب تک علم نہ ہو سکا۔ دوسری مرتبہ منشی نور الدین نے اسے اپنے مطبع دار السلام (واقع حوض قاضی) میں چھاپا۔ یہ اپریل ۱۸۵۳ء کا واقعہ ہے۔ اس چھاپے کا ایک نسخہ رام پور کے کتب خانے میں اور ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

ناقص اور غلط

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ پہلی مرتبہ "پنج آہنگ" کتنی چھاپی گئی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ پانسو سے زیادہ نسخے طبع نہ ہوئے ہوں گے۔ تاہم یہ نسخے باوجود گرانیٔ قیمت تین سال میں فروخت ہو گئے۔ لہٰذا اسے دوسری مرتبہ چھاپنے کی نوبت آئی۔ اغلب ہے اس وقت تک میرزا کے پاس مزید فارسی خطوط فراہم ہو گئے ہوں اور پنج آہنگ کے دوسرے چھاپے کی ضخامت کسی قدر بڑھ گئی ہو۔

میرزا نے اردو مکاتیب میں ان طباعتوں کا ذکر دو مرتبہ کیا ہے۔ وہ صاحب عالم مارہروی کو ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں کہ چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ اول یہ کہ بعد از انطباع نثر جو کچھ تحریر ہوا، وہ ان میں نہیں۔ دوسرے غلط بے حد ہیں۔

> کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر مجموں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ شاید حکیم غلام نجف خاں نے تصحیح کا پورا اہتمام نہ کیا۔ لیکن میرزا غیور زاہنؔ آدم کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

> پنج آہنگ تم نے مول لی اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں، ایک بادشاہی چھاپے خانے اور ایک منشی نور الدین کے چھاپہ خانے کا۔ پہلا ناقص ہے اور دوسرا سراسر غلط ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب مطبع سلطانی میں چھپی تھی، اس میں غلطیاں نہ تھیں۔ البتہ مکاتیب کم تھے یا جو نثریں ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان لکھی گئیں یا فراہم ہوئیں وہ اس میں شامل نہ تھیں۔ اس کے خلاف مطبع دار السلام کا نسخہ بہت غلط چھپا تھا۔

پنج آہنگ کا اشتہار

پہلی طباعت کا اشتہار دہلی کے ایک اخبار "فوائد الناظرین" میں ۳ ستمبر ۱۸۴۹ء کو پہلے صفحے پر چھپا تھا۔ اسے بہ طور تبرک ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

"فارسی دانانِ زبان کو مژدہ ہو کہ ان دنوں ہیں مجموعہ نثر ہائے زنگارنگ مسمّی بہ پنج آہنگ از نتائج طبع افصح الفصحا و ابلغ البلغا حضرت مولانا جناب مرزا اسد اللہ خاں بہادر مدظلہ بہ تصحیح و ترتیب والا شان، عالی خاندان، عظیم الخلق، عمیم الاحسان عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں بہادر زیبِ مطبع سلطانی کے طبع ہو کر طیار ہے اور یہ کتاب کاغذ ولایتی پر بہت خوش خط نستعلیق چھپی ہے اور صفحے اس نسخہ متبرک کے ۳۹۴ ہیں۔ قیمت اس کی چار روپے مقرر ہے۔ جس کسی صاحب کو خریداری اس کتاب کی منظور ہو ایک درخواست مع زرِ ثمن کے نزد جناب حکیم صاحب ممدوح یا نزد خاکسار ارسال فرما دیں، کتاب مذکورہ فوراً ارسال خدمت ہو گی۔"

خاکسار سے مقصود "فوائد الناظرین" کا ایڈیٹر ہے۔

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

"قدم بڑھا کے چلو

اے رنگِ روئے زمانہ نکھارنے والو
تمام جگ کا مقدّر سنوارنے والو
بنامِ شوق دلوں کو اُبھارنے والو
چلو چلو یونہی ہمّت کے گُن دکھا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

بڑھو بلند ارادوں کی روشنی لے کر
پیامِ امن و اماں، صلح و آشتی لے کر
ہر ایک سمت چلو جوشِ زندگی لے کر
رہِ حیات کو قدموں سے جگمگا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

تمھیں ملال نہ ہو اجنبی فضاؤں کا
کرو نہ خوف کبھی آفتوں بلاؤں کا
چلو تو ایسے کہ رُخ موڑ دو ہواؤں کا
مصیبتوں پہ کھلے دل سے مسکرا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

دلوں میں شمعِ یقین و عمل جلاتے ہوئے
قدم قدم پہ نئے ولولے جگاتے ہوئے
اندھیری شب میں اُجالوں کے گیت گاتے ہوئے
چلو قدم کو ذرا تیز تر اُٹھا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

یہ لطف و عیش کی خاطر رکاؤ کیا معنی
گھنیری چھاؤں میں لمبا پڑاؤ کیا معنی
جو سب ہیں ایک تو پھر بھید بھاؤ کیا معنی
بچھڑ گئے ہیں جو ان کو گلے لگا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

گرے ہوئے ہیں جو نیچے انھیں اُٹھانا ہے
تمام بگڑے نصیبوں کو پھر بنانا ہے
یہ مرحلے ہیں کٹھن، ان کے پار جانا ہے
کمالِ شوق یہی ہے کہ سر اُٹھا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

آج کل دہلی (غالب نمبر)

عبادت بریلوی

غالب کے تغزّل کا سماجی پہلو

غالب نے اپنے آپ کو خود اپنی شکست کی آواز کہا ہے۔ وہ 'گل نغمہ' اور 'پردۂ ساز' نہیں تھے۔ حالاں کہ انھیں اس بات کی تمنا تھی۔ وہ اسی کی آرزو کرتے رہے۔ اُن کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اس آرزو کو تکمیل سے ہم کنار ہونا نصیب نہ ہوا اور وہ ہمیشہ مرنے کی آرزو میں مرتے رہے۔ ساری زندگی انھیں ماتمِ یک شہر آرزو ہی رہا۔ اور ایک آرزو کا کیا ذکر ہے خموشی میں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں انھیں نہاں نظر آئیں۔ ان خوں گشتہ آرزوؤں نے انھیں گورِ غریباں کا ایک چراغِ مُردہ بنا دیا۔ وہ درخورِ محفل نہ رہے۔ اس غم کے ہاتھوں اُن کی شخصیت نے ایک شمعِ کُشتہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ وہ زندگی میں کئی بار مرے، بلکہ بار بار مرتے رہے لیکن انھیں موت نہ آئی۔ داغِ حسرتِ ہستی اُن کی زندگی کا جزو بن گیا۔ جس شخص کی زندگی میں حسرتِ ہستی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے۔ اور جس کی زندگی موت کی راہ دیکھتے ہوئے گزر جائے لیکن پھر بھی اُسے موت نہ آئے۔ اُس کے غم کا بھلا کیا ٹھکانہ ہے۔

یہ شدتِ غم جو غالب کے یہاں ملتی ہے وہ محض ذاتی اور انفرادی غم کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اُس کی تہہ میں تو زمانے کا غم کارفرما نظر آتا ہے۔ غالب اپنے ذاتی اور انفرادی غم کا سلسلہ اسی زمانے کے غم سے ملاتے ہیں۔ زمانے کا غم ہی اُن کے نزدیک اس انفرادی غم کا محرک ہوا کرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ فرد کو خلا میں معلق نہیں سمجھتے۔ اُن کے خیال میں فرد سماج سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سماجی حالات اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی اثر سے اُس کی شخصیت بنتی اور بگڑتی ہے۔ اسی اثر کے ہاتھوں اُس کا مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ اسی کے توسط سے وہ ایک مخصوص شکل اختیار کرتی ہے۔ غالب اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو، اپنے حالات کو، اپنے مسائل کو اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے واقعات سے الگ نہیں کیا ہے۔ اُن کا خمیر اپنے زمانے کی زندگی سے اٹھا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اُسی زندگی کا ایک فرد سمجھا ہے۔ کیونکہ اُس زندگی کے حالات ان پر برابر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ ان حالات کے نشیب و فراز نے اُن کی زندگی کو متزلزل کیا ہے۔ انھیں خاصے ہچکولے کھانے پڑے ہیں۔ زندہ رہنے اور زیست کرنے کے لئے انھیں خاصی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ جو کچھ وہ کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بھی انھیں طوعاً و کرہاً کرنا پڑا ہے۔ جس کام کو اُن کا جی نہیں چاہتا تھا اُس کو بھی وہ کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ کی خاک چھانی ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ جس چیز کی انھیں تمنا تھی وہ حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ جب زندگی کی سماجی بنیاد متزلزل ہو گئی ہو تو یہی ہوتا ہے۔ جب نظامِ اقدار میں ہمواری نہ رہی ہو تو یہی حالات پیدا ہوتے ہیں۔ جب اصول اور معیار باقی نہ رہیں تو افراد کی زندگیوں میں یہی صورت حال رونما ہوتی ہے۔ جب کوئی نصب العین نہ رہے تو ہر شخص کو انھیں حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جب کوئی نظریۂ حیات ہی نہ رہے تو ہر ایک کے سر سے موجِ خوں کچھ اسی طرح گزرتی ہے۔

غالب کو اپنے زمانے کی زندگی میں برپا ہونے والے حشر کا بخوبی علم تھا۔ وہ اس عرصۂ محشر کا سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بلکہ یہ سب کچھ تو اُن پر بیت رہی تھی۔ اس لئے وہ ان حالات کے محض خاموش تماشائی ہی نہیں تھے۔ وہ تو ان حالات کے سمندر میں پڑے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اُن کا دل تو سیلیِ خارا سے زنگ تھا لیکن وہ جینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان حالات کو معمول پر لانا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُن کا سدھارنا اُن کے قابو میں نہیں تھا۔ اس لئے وہ عملی طور پر اپنی ذات کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے کا خیال اُن کے پیشِ نظر زیادہ رہتا ہے اور بادی النظر میں دیکھنے والے یہی محسوس کرتے ہیں کہ

اپنی ذات انھیں بہت عزیز تھی، اپنا مفاد ہی اُن کے نزدیک سب کچھ تھا۔ اس سے آگے سے باہر نکل کر وہ دیکھتے اور سوچتے ہی نہیں تھے۔ اور یہ بات ایسی کچھ غلط نہیں ہے لیکن اس کو تسلیم کر لینے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب جو کچھ اپنی ذات کے لئے کر رہے تھے اُس میں درحقیقت اپنے طبقے کی روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش بھی شامل تھی۔ اپنی خاندانی وجاہت کو برقرار رکھنے کا خیال بھی موجود تھا۔ اپنی معاشرت کی آن اور تہذیب کی شان کو نمایاں کرنے کی خواہش بھی کارفرما تھی۔ غالب اپنی ذاتی زبوں حالی پر کڑھتے ضرور تھے۔ اس پر خون کے آنسو ضرور بہاتے تھے۔ لیکن ان سب کی تہہ میں یہ خیال ضرور ہوتا تھا کہ اس زبوں حالی کے ہاتھوں اُن کی خاندانی وجاہت اور نسلی برتری پر حرف آ رہا ہے، اُن کے طبقے کی رسوائی ہو رہی ہے، اُن کی معاشرت پر نزع کا سا عالم ہے اور اُن کی تہذیب کا دم نکل رہا ہے۔ اس کی گونج غالب کی شخصیت اور اُن کے فن میں جگہ جگہ سنائی دیتی ہے۔ بعض اوقات ان آوازوں کا پہچاننا ذرا مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن غالب کے مزاج سے ذرا سی واقفیت اور اُن کے فن کی روح سے تھوڑا سا لگاؤ بھی ان باتوں کو بہت واضح کر دیتا ہے۔ اور ان کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ اگر ایسا کیا جائے تو یہ آوازیں ذہن و شعور پر چھا جاتی ہیں اور روح کے تہہ در تہہ گوشوں میں بھی اُن کا آہنگ اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

وہ ماحول جس میں غالب نے آنکھ کھولی سیاسی، تہذیبی اور سماجی اعتبار سے ایک ایسا ماحول تھا جس میں انتشار اور بدنظمی تھی۔ ایک سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا۔ ایک معاشرت کی بنیادیں ہل چکی تھیں، ایک تہذیب نے جو چراغ روشن کئے تھے وہ آندھیوں کی زد پر تھے۔ مغلوں کے اقبال کا آفتاب گہنا چکا تھا۔ اب وہ صرف نام کے حکمران رہ گئے تھے۔ طاقت ختم ہو چکی تھی اور اس کی وجہ سے صدیوں کی بنی بنائی حکومت کا وجود خاک میں مل گیا تھا۔ حکومت کی کمزوری سے جو انتشار پیدا ہو سکتا ہے وہ اس ماحول میں عام تھا۔ افراد زندگی سے بیزار تھے۔ انھیں اپنے مستقبل کا علم نہیں تھا وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کی زندگیوں میں کوئی اُستواری نہیں تھی۔ وہ کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے تھے۔ اس سیاسی انتشار نے سماجی زندگی کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس میں ایک خلا کی سی کیفیت تھی۔ البتہ تغیر کا عمل جاری تھا نئے سماجی حالات پیدا ہو رہے تھے، نئی قدریں وجود میں آ رہی تھیں۔ لیکن ان حالات اور ان قدروں سے بہت سے لوگوں نے مطابقت پیدا نہیں کی تھی۔ اُن کے لئے یہ تغیر عجیب و غریب تھا۔ اس لئے وہ اپنی سماجی روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں ان روایات کے دم توڑنے اور ختم ہو جانے کا بڑا غم تھا۔ وہ اس پر آنسو بہاتے تھے اس کا رونا روتے تھے۔ سیاسی اور سماجی انتشار کا اثر تہذیبی معاملات پر یہ ہوا تھا کہ لوگ اس کو حسرت سے دیکھتے تھے۔ تہذیب کی جو عظیم روایت مغلوں نے قائم کی تھی اُس کا ارتقا جیسے رُک گیا تھا۔ اس کے آگے بڑھنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ ناسازگار حالات راہ کا روڑہ بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ تہذیب سب کو عزیز تھی۔ اس لئے اس کی ارتقائی کیفیت کے رُک جانے کا سب کو غم تھا سب کے سب سوگوار تھے۔ سب کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ نئی زندگی کا آفتاب طلوع ضرور ہو چکا تھا لیکن ابھی دھندلکے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ زندگی کو بدلنے اور اس میں نئے حالات پیدا کرنے کے خیالات بھی کسی نہ کسی صورت میں پیدا ہونے لگے تھے اور ان خیالات نے نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ان تحریکوں کے سامنے بھی کوئی بہت واضح نصب العین نہیں تھا۔ اسی لئے اُن کی کامیابی کی توقع کم تھی۔ معاشی اور اقتصادی زبوں حالی تو ان حالات میں پیدا ہونی ہی چاہیئے۔ پُرانے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں لیکن اس کی جگہ ابھی کوئی مستقل نظام نہیں لے سکا تھا۔ نئی جاگیرداری کے پیدا ہونے کے آثار نظر آتے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کا ہیولیٰ تیار نہیں ہوا تھا اور کوئی خاص شکل نہیں بنی تھی۔ اس لئے ہر شخص مادی اور ذہنی دونوں اعتبار سے پریشانی اور زبوں حالی کا شکار تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ زندگی کون سی کروٹ بدلنے والی ہے۔ اور حالات کون سا رُخ تیار کرنے والے ہیں۔ ان حالات نے احساسِ شکست کو عام کیا۔ شکست خوردگی افراد کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی۔ رنج و الم اُن پر چھا گئے۔ چناں چہ حالت اُس وقت یہ تھی کہ رونا زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ زندگی مر مر کے جئے جانے کا نام بن گئی تھی۔ اور لوگ غالب کی طرح مرنے کی آرزو میں مرنے لگے تھے۔ ظاہر ہے ان حالات میں جذباتیت کو تو ختم ہونا ہی چاہیئے تھا۔ چناں چہ نری جذباتیت زندگی میں کم ہو گئی تھی اور زندگی کے حقائق کا شعور بڑھنے لگا تھا۔ حقائق کی تلاش و جستجو کی طرف توجہ عام ہونے لگی تھی۔ لوگ سوچنے اور غور کرنے لگے تھے۔ حالات نے انھیں زیادہ حساس بنا دیا تھا اور وہ ایسی باتوں کے بارے میں بھی اظہار کرنے لگے تھے جن پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔

غالب اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور اُن کی شخصیت اسی کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اور اُن کا فن بھی اسی کا ترجمان ہے۔ اُن کے خیالات و نظریات بھی اسی ماحول

کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالبؔ صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نہیں تھے۔ اُن کی آنکھیں صرف اندر ہی کی طرف نہیں کھلتی تھیں۔ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر بھی دیکھتے تھے۔ اس زمانے کی اجتماعی زندگی کا سارا نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اُس کے سارے نشیب و فراز اُن کی نظر میں تھے۔ ان حالات نے انھیں متاثر کیا اور اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اپنی غزلوں میں ان حالات کی ترجمانی کے لئے مجبور ہوئے، کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ۔ لیکن اس حالات کی ترجمانی انھوں نے کی ضرور ہے۔ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں کرتے تھے۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں ان حالات کے جو مختلف موڑ اور اس ماحول کے جو مختلف پہلو ہیں اُن کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جس کے پاس غزل کا صحیح مذاق اور اُس کے مزاج کا صحیح شعور ہے۔ جو اس فن کے آداب کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ اُس کو غالب کی غزلوں کے ایسے اشعار میں بھی معانی کی دنیائیں نظر آ سکتی ہیں جو خالص تغزل سے تعلق رکھتے ہیں۔ غزل کا شاعر حسن و عشق کے پردے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ نہ جانے کتنے تاثرات ہوتے ہیں جن سے غزل کا ایک شعر پیدا ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنا وسیع پس منظر ہوتا ہے جس میں کسی ایک خیال کی تصویر بنتی ہے۔ نہ جانے کتنے محرکات ہوتے ہیں جن سے کسی ایک موضوع کا وجود ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں بظاہر جو حسن و عشق اور اُس کے متعلقات کی باتیں ہیں وہ اُن کے ماحول اور مخصوص حالات کے کسی نہایت ہی اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اُن کے خالص داخلی اور انفرادی خیالات میں بھی ایک سماجی اور اجتماعی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ غالبؔ کی غزلوں کے اشعار کو اُن کے اجتماعی شعور سے الگ کر کے دیکھنا اُن کے ساتھ زیادتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالبؔ جذباتی معاملات تک کی ترجمانی میں اس اجتماعی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی کے خالص انفرادی اور جذباتی معاملات کو بھی غالبؔ نے ایک سماجی اور اجتماعی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ وہ ان دونوں کو الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے حسن و عشق اور اُس کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے لیکن ان سب کو صرف جذبات کے حدود ہی میں نہیں رہنے دیا ہے بلکہ ہمیشہ ان کی یہ باتیں جذباتی حدود کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہیں۔ اور وہ ان باتوں کو پیش کرتے ہوئے زندگی کی نہایت ہی سنگین اور تلخ حقیقتوں کی تفصیل پیش کرنے لگتے ہیں۔ حسن اُن کے یہاں ایک کیفیت ہے، ایک حسنِ نظر ہے۔ انسان کا حسن سے دلچسپی لینا فطری بات ہے۔ اس میں بڑا لطف ہے، بڑا ہی کیف ہے۔ لیکن اس حسن سے دلچسپی لینے کے بھی کچھ آداب ہیں۔ ان آداب کے بغیر صحیح حسن پرستی ممکن نہیں۔ بوالہوس اگر حسن پرستی شعار کرے تو آبروئے شیوۂ اہلِ نظر جاتی رہتی ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

گویا غالبؔ کے خیال میں حسن پرستی کے کچھ معیار ہیں۔ اور یہ معیار حالات کے پابند ہیں۔ سماجی زندگی میں بوالہوس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیوں کہ وہ کسی اخلاقی معیار کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر بلند قدریں نہیں ہوتیں۔ اعلیٰ معیار نہیں ہوتے۔ اور اس لئے اُس کے ہاتھوں بنیادی سماجی اقدار کی نفی ہوتی ہے۔ غالبؔ کے یہاں حسن پرستی نیازِ عشق کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ عشق زندگی میں اپنا ایک نظام رکھتا ہے۔ وہ زندگی کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے۔ اُس کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور سماجی زندگی خود اُس سے متاثر ہوتی ہے۔ اُن کا آپس میں ایک ربط ہے۔ اس لئے ان دونوں کو الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ غالبؔ کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

لکدکوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

یہاں غالبؔ نے جس عشق کا بیان کیا ہے وہ صرف ایک جذباتی اور رومانی کیفیت ہی نہیں۔ بلکہ وہ سماجی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے غمِ عشق اور غمِ روزگار ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ محبت کرنے والا رہینِ ستم ہائے روزگار رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہتا۔ اور بعض اوقات تو زمانہ اُس پر ایسے ستم ڈھاتا ہے کہ محبوب کی وفا سے بھی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ عشق کے ساتھ غمِ روزگار کا یہ تصور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ غالب عشق کو سماجی زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے۔ ان دونوں کا خیال اُن کے یہاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کو خانوں میں نہیں بانٹتے تھے۔ اُن کے یہاں تو عشق زندگی ہے اور زندگی عشق۔ غالبؔ کے زمانے میں عشق کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے پتھر کے کلیجے کی ضرورت تھی۔ سماجی حالات کی ناہمواری نے اس وقت

افراد کو غمِ عشق سے زیادہ غمِ روزگار کا شکار کر دیا تھا۔ غالبؔ نے اپنی غزلوں میں اسی صورتِ حال کی ترجمانی کی ہے۔ اور اس ترجمانی میں اُن کے سماجی شعور کو بڑا دخل ہے۔

اور یہ سماجی شعور غالبؔ کے یہاں اس قدر بڑھا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اُس زمانے کی زندگی کا اچھا خاصا مرثیہ لکھنے لگے ہیں۔ اسلوب غزل کا ہے زبان تغزل کی ہے۔ مضامین بظاہر عشقیہ ہیں۔ لیکن ایسے اشعار کی تہہ میں بھی اُس زمانے کے سماجی حالات اور اُس کی زبوں حالی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور اس زبوں حالی نے جو اثرات چھوڑے ہیں اُس کا نقشہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ بظاہر تو غالبؔ کے ان اشعار میں غمِ جاناں اور غمِ عشق کی باتیں ہیں لیکن درحقیقت ان میں غمِ عشق اور غمِ روزگار کا تذکرہ ہے۔ ان پر پردے ضرور پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ان پردوں کو ذرا اٹھا کر دیکھا جائے تو اُن کے پیچھے اُس زمانے کی زندگی کی عام سماجی حالت، اُس کے بنیادی معاملات، اُس کے اساسی مسائل، اور افراد پر ان سب کے ردِ عمل کے مختلف پہلو بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی سماجی اور اجتماعی زندگی کا کیا حال تھا؟ افراد پر کیا بیت رہی تھی۔ اور وہ اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟

غالبؔ کو اپنی تہذیبی عظمت کا احساس تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اُن کی تہذیب نے جو روایت قائم کی ہے۔ اُس پر یقیناً فخر کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے جو کارنامے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اُن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اُن کا جی یہی چاہتا ہے کہ اُن کی تہذیبی روایت میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوتا اور وہ اس سے کہیں زیادہ ترقی کرتی۔ یہ خیال غالبؔ کے یہاں اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس تہذیبی روایت کو آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ جب انھیں اس کا قافلہ رکتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب انھیں اس میں تھکن کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو انھیں اس خیال کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ شعر کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بظاہر تو یہ شعر ایک انفرادی جذبے کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تہہ میں درحقیقت ایک سماجی اور اجتماعی شعور کی کارفرمائی ہے۔ غالبؔ نے اس سماجی اور تہذیبی حقیقت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اور وہ اس کا اظہار کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس خیال کی ترجمانی اُن سے اس ماحول ہی نے کرائی ہے۔ جس میں سماجی انتشار تہذیبی ارتقائی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ اور اُس کے آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے جس میں اسی بنیادی خیال کو، غالبؔ نے کچھ اور بھی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ غالبؔ کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اُٹھ جانے کا بڑا غم تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ اس کو ایک بہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ صورتِ حال پوری قوم کے لئے افسوسناک تھی ظاہر ہے مغلوں کی طاقت کا ختم ہونا ہندوستان کی تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اُس نے تو افراد کی قسمتیں بدل دی تھیں۔ سماجی زندگی کے دھارے کے رُخ کو موڑ دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہنگامے ہوئے۔ انتشار پیدا ہوا۔ اس انتشار اور ہنگامے کے اثرات افراد پر ہوئے۔ اُن کے ناموس پر آنچ آئی۔ اُن کی عزّت اور وقعت جو سب سے بڑی دولت تھی، خاک میں مل گئی۔ ان حالات میں افراد اپنے آپ کو بے آبرو محسوس کرنے لگے۔ غالبؔ نے جب یہ شعر کہا تو اُس کی تہہ میں درحقیقت یہی خیال تھا ؎

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں آدم کے خُلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لے کر نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا گیا ہے خُلد سے آدم کا نکلنا انسانیت کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ غالب اپنے تہذیبی انحطاط کو اس سانحے سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے اُس زندگی پر آنچ آئی جو اپنے تہذیبی کارناموں کے باعث انسانیت کے لئے ایک بہت بڑی دولت تھی۔ اُس معاشرت میں انتشار پیدا ہوا جو اپنی اعلیٰ اقدار کے باعث دنیا جہان میں مشہور تھی۔

اور اس صورتِ حال کے اثرات بڑے ہی دُور رس ہوئے کساد بازاری کا دَور دورہ ہوا۔ معیار باقی نہ رہے۔ قدریں منتشر ہو گئیں۔ اصول ڈانواڈول ہو گئے۔ ہر شخص کو ان حالات کا شکار ہونا پڑا۔ اس ہنگامے اور انتشار میں کسی ایک کو بھی طمانیت نصیب نہ ہوئی۔ نفسی نفسی کا عالم پیدا ہوا۔ ایک دوسرے سے توقعات اٹھ گئیں۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رہا۔ کیونکہ خستگی تو زندگی کا عام انداز بن گئی۔ غالبؔ نے اس شعر میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ہے ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

صاف ظاہر ہے کہ سماجی زندگی کے انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی زبوں حالی اس شعر کی بنیاد ہے۔ اس شعر میں تو انفرادی اور داخلی آہنگ کا شائبہ بھی نہیں۔ یہ

میں تو اجتماعی زندگی کے عام انتشار کا نقشہ ایک عالمِ خستگی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نقشے میں وہ صورتِ حال بہت واضح ہے۔ جس کا غالبؔ کو بڑا غم تھا اور جس پر وہ ساری زندگی خون کے آنسو بہاتے رہے۔

غالبؔ کی ایک اور غزل ہے جس کے بیشتر اشعار میں سوزِ نہاں سے دل کے بے محابا جلنے اس میں ذوقِ وصل اور یادِ یار تک کے باقی نہ رہنے، گھر کو آگ لگنے اور اس کے نتیجے میں سب کچھ جل جانے، اپنے عدم سے پرے ہونے اور اس کی وجہ سے آہِ آتشیں تک کے بے اثر ہو جانے کا تذکرہ ہے۔ اس میں غالبؔ نے افسردگی کی آرزو بھی کی ہے۔ کیوں کہ طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا نے انھیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اس کی تفصیل خود غالبؔ ہی کی زبانی سُنئے ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

ان اشعار میں شخصی اور انفرادی باتیں ضرور ہیں۔ لیکن ان باتوں کو صرف انفرادی جذباتی زندگی کے معاملات تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ان اشعار کا مجموعی تاثر زندگی کے کسی اور ہی تاثر کی تصویر دکھاتا ہے۔ غالبؔ یہاں یہی کہنا چاہتے ہیں کہ اُن کے معاشرے میں ہر شخص کا دل سوزِ نہاں سے بے محابا جل رہا ہے۔ ساری سماجی زندگی میں بس ایک سُلگنے والی کیفیت ہے۔ پوری تہذیب میں ایک آگ سی اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ اور اس زندگی، معاشرت اور تہذیب پر ایک اُداسی اور سوگواری کا عالم ہے۔ دلوں کی بستیاں ویران ہیں۔ ان میں اُمنگ نہیں، ولولہ نہیں، حوصلہ نہیں، ان سب پر اوس سی پڑ گئی ہے۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھنے کا خیال ہے نہ آگے بڑھنے کی تمنّا، بس ایک حسرت اور مایوسی کا عالم ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس آگ نے گھر کی ایک ایک چیز کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ اسی لئے معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں کوئی گرمی اور گرم بازاری نظر نہیں آتی۔ کسی قسم کی ہُمہمہ اور جولانی کا پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ زندگی کو حالات نے کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ وہ عدم سے بھی پرے معلوم ہوتی ہے۔ اُس پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ اور اُس کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ موت سے بھی کچھ آگے ہے۔ اس عالم میں بے دلی تو عام ہونی ہی چاہئے۔ چناں چہ یہ بے دلی ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے اور اس بے دلی کا یہ اثر ہے کہ ہر شخص افسردگی کی آرزو کر رہا ہے۔ کیونکہ زندگی سے جو توقعات وہ رکھتا ہے اُن کے پورے ہونے کا، ان حالات میں، کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالبؔ یہاں اسی صورتِ حال پر ماتم کر رہے ہیں۔

جب زندگی اس منزل پر آ جائے تو ظاہر ہے اُس میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہ سکتی۔ ان حالات میں تو اُس کا خود اپنے آپ سے بیگانہ ہو جانا یقینی۔ ایسے ہی عالم میں بے دماغی کا وجود ہوتا ہے جو موجِ بوئے گل کو اُس کے سحر سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کا اثر الٹا ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز سے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ موجِ بوئے گل تک سے دم ناک میں آنے لگتا ہے۔ سیرِ گل کو جی نہیں چاہتا۔ کیونکہ گلوں کے خندہ ہائے بے جا برداشت نہیں ہوتے ؎

بہت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ہم فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

یہ اشعار شکست خوردگی اور احساسِ شکست کی کیفیت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں جب اجتماعی زندگی میں مایوسیوں کا بسیرا ہو تو افرادِ معاشرہ یاس اور گردو پیش سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات بھی انھیں اچھی نہیں لگتی۔ کسی چیز سے بھی اُن کا دل نہیں بہلتا۔ انھیں زندگی میں کسی قسم کی کوئی دل کشی نظر نہیں آتی۔ وہ دُنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اُن کی زندگی ایک مستقل کرب کے عالم میں بسر ہوتی ہے۔ غالبؔ نے یہاں اسی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے۔ اُن کے زمانے میں زندگی کا کچھ یہی حال ہو گیا تھا۔ کوئی منزل سامنے نہیں تھی۔ کوئی نصب العین پیشِ نظر نہیں تھا۔ اسی لئے لوگ زندگی سے دُور بھاگتے تھے۔ انھیں اس کی مسرتوں اور دلآویزیوں سے جیسے کوئی تعلق ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اور یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں تھی۔ جب اجتماعی زندگی کے اُفق پر انحطاط و زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں تو افراد کو کچھ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اُن کی ذہنی کیفیت کچھ اسی طرح کی ہو جاتی ہے۔

اس سماجی انحطاط اور تہذیبی زوال کے باعث پیدا ہونے والی تباہی اور ویرانی کا بیان غالب نے اپنی غزلوں میں جگہ جگہ کیا ہے۔ اُن کے یہاں ان خیالات کی ایک لہری دوڑی ہوئی ہے۔ مختلف پہلوؤں سے اس کا بیان اُن کے یہاں ہوتا ہے۔ مختلف زاویوں سے وہ اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اُس انحطاط و زوال کی پوری تصویر اُن کے کلام میں سے اُبھرتی ہے۔ اس کی تفصیل بے شک

اُن کے یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں غالب کا نقطۂ نظر تمام تر خارجی نہیں تھا۔ البتہ جو مجموعی تضاد وہ قائم کرتے ہیں اُس سے اُس زمانے کے افراد کی اُس ذہنی کیفیت کا سارا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو انحطاط و زوال نے پیدا کی تھی۔ اس موضوع پر غالب نے کیسے بھرپور شعر انھوں نے نکالے ہیں۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

گریوں ہی روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

یہ سب کچھ انحطاط و زوال ہی کا اثر ہے کہ غالب کی نظریں کاشانے کی خرابی دیکھتی ہیں اور در و دیوار سے انھیں جنگل بیابان کی سی کیفیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دُور دُور تک ویرانی کا بسیرا دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ حدِ نظر تک وحشت ہی وحشت ہے۔ تہذیب اور تہذیب کے علم برداروں کا حال ایسا ہے جیسے کوئی شمع کو بجھا دے۔ محفلیں سونی پڑی ہیں۔ زندگی کی محفل سے بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ہر ایک پریشان ہی نکلتا ہے۔ ساری زندگی ایک ظلمت کدہ بن گئی ہے۔ اس ظلمت کدے میں شبِ غم کا جوش ہے۔ دلیلِ سحر ایک شمع ہو سکتی تھی سو وہ بھی خاموش پڑی ہے۔ ایسے میں مژدۂ وصال اور نظارۂ جمال کا خیال بے معنی بات ہے۔ لیکن اس عالم میں بیتی ہوئی بہار کا خیال آنا لازمی ہے۔ غالب کو یہ خیال آتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گل فروش تھا۔ لطفِ خرامِ ساقی جنتِ نگاہ اور ذوقِ صدائے چنگ فردوسِ گوش بنے ہوئے تھے۔ لیکن زمانے نے یہ بساط اُلٹ دی۔ سرور و شور اور جوش و خروش باقی نہ رہا۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی، سو اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی ـــ اس کے ساتھ ہی غالب کو اپنی معاشرت اور تہذیب کی محرومی کا خیال بھی آتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جو اس تہذیب کے علم بردار ہیں وہ پیغام کے تشنہ لب ہیں۔ اُن کے پاس کامیابی اور کامرانی کا کوئی پیغام نہیں آتا اور اُن کے سامنے غیر بھری محفل میں جام کے بوسے لے رہے ہیں۔ لیکن وہ اس صورتِ حال کا شکوہ نہیں کرتے کیونکہ اُن کے نزدیک یہ تو سب چرخِ نیلی فام کے ہتھکنڈے ہیں۔ غالب کو اس صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہے کیونکہ انھیں اس کی وجہ سے ہر شخص گریہ و زاری کرتا ہوا نظر آ رہا ہے ـــ اور یہ آثار کچھ اچھے نہیں کیونکہ گریہ و زاری اچھا شگون نہیں، اس سے تو بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ یہ منظر غالب کے سامنے ہے۔

ان اشعار میں بھی بنیادی طور پر ذاتی اور انفرادی آہنگ موجود ہے لیکن چونکہ یہ سب کے سب اُس ذہنی کیفیت کے ترجمان ہیں جو اس وقت ہر شخص پر طاری تھی۔ اس لئے یہاں اس انفرادیت میں بھی ایک اجتماعی آہنگ کا احساس ہوتا ہے، اور سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ اشعار پوری طرح اُس زمانے کی اجتماعی زندگی کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے کی عام حالت کا ان سے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ سماجی حالت اور اجتماعی زندگی کی یہ کیفیت افراد کے لئے خاصی پریشان کن رہی ہے۔ وہ اس پر کڑھتے رہے ہیں لیکن انھیں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے انھیں نہ جانے کس کس بات کی حسرت رہی ہے۔ وہ ایسے شب و روز اور ماہ و سال کا خیال کرتے رہے ہیں جو اب موجود نہیں۔ کاروبارِ شوق کو انھوں نے ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ذوقِ نظارۂ جمال انھیں خاک میں ملتا ہوا نظر آیا ہے، اور وہ اس پر لہو روئے ہیں۔ لیکن دل کھول کر لہو رونے کی بھی انھیں فرصت نہیں ملی ہے۔ فکرِ دنیا میں انھیں سر کھپانا پڑا ہے۔ حالانکہ اس کے بارے میں انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ـــ وہ تو اس کو ہمیشہ جان کا وبال ہی سمجھتے رہے تھے۔ غالب نے کس خوبی سے اس صورتِ حال کی ترجمانی کی ہے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا   دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں

درحقیقت غالب نے یہاں اُس طبقے کی ترجمانی کی ہے جس پر اس انحطاط وزوال اور افراتفری وانتشار کا اثر سب سے زیادہ تھا۔ جس کے افراد اپنے آپ کو ایک عظیم تہذیب اور تہذیبی روایت کا علم بردار سمجھتے تھے۔ جب وہ پیچھے مڑکر دیکھتے تو انھیں اپنی ایک عظیم تہذیبی روایت کی تاریخ دُور دُور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور وہ اس تہذیبی روایت میں کاروبارِ شوق کے ہنگامے دیکھتے تھے۔ نظارۂ جمال انھیں اس کی بنیادی خصوصیت نظر آتی تھی۔ یہ تو گویا اُس کی گھُٹی میں پڑی تھی۔ حسن کے درمیان زندگی بسر کرنا اور خود حسن کو تخلیق کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن اب اُن افراد کی نظریں یہ دیکھتی تھیں کہ یہ سارا کاروبار ختم ہوچکا ہے۔ اب نہ حسن ہے نہ حسن کی تخلیق۔ اب تو بس فکرِ دنیا میں سر کھپانا رہ گیا ہے۔ غالب کے ان اشعار میں انھیں خیالات کی گونج اور انھیں احساسات کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔

یہ حالات، ظاہر ہے کہ طاقت ختم ہوجانے کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ لوگوں نے طاقت کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا لیکن وہ کچھ کر نہ سکے۔ کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ خود طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس موقع سے نئی طاقتوں نے فائدہ اُٹھایا اور وہ حکمراں ہوگئیں۔ ان کے ہتھکنڈوں کو اس زمانے کے لوگ سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے کچھ لوگوں پر اس کا اثر بھی ہوا اور وہ ان کے دام میں پھنس گئے۔ اُن کی اُلفت کا دم بھرنے لگے لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے پابہ زنجیر ہونے کا احساس بہر صورت رہا۔ کون جانے کہ غالب نے اپنے اس شعر میں اسی صورت حال کی ترجمانی کی ہو ؎

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

اس زمانے کے ہندوستان، خصوصاً دلّی کے سیاسی حالات کو سامنے رکھا جائے تو اس شعر میں بڑی معنوی وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاستِ افرنگ نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا اور اس سرزمین پر دام بچھا دئے گئے تھے۔ لیکن بھولے بھالے لوگوں نے انھیں دام سمجھا نہیں تھا۔ اُن میں پرواز کی طاقت موجود تھی لیکن وہ اُڑ نہیں سکتے تھے۔ اُلفتِ صیاد اُن کا راستہ روکتی تھی۔ اس زمانے کی تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

غالب نے یہاں 'طاقتِ پرواز' کا ذکر کیا ہے، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کی صلاحیتوں سے بے خبر نہیں تھے۔ اُن کے خیال میں تو اس وقت بھی بہت کچھ ہوسکتا تھا لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کشاکشِ غمِ پنہاں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ کوئی اقدام کیا جاتا ؎

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

یہاں مجنوں کی تلمیح کو پیش کرکے غالب نے اسی صورتِ حال کی وضاحت کی ہے۔

اس وقت عمل کا ماحول نہیں تھا لیکن دلوں میں اس عمل کی خواہش ضرور تھی۔ حوصلہ اور ولولہ ضرور تھا۔ لوگ تعمیر چاہتے تھے لیکن یہ تعمیر صرف آرزو اور تمنا ہی تک محدود تھی۔ غالب نے اس کیفیت کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اس شعر میں منظر، بلندی، عرش اور مکان سب علامتی حیثیت رکھتے ہیں اور اس زمانے کی عملی زندگی کا جو حال تھا، لوگ جو کچھ سوچ رہے تھے، جس چیز کی انھیں آرزو اور تمنا تھی، اس کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔

یہ خیال غالب کے یہاں پیدا نہ ہوتا اگر اُن کے پاس اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کے حالات کا شعور نہ ہوتا۔ وہ ان حالات کا پورا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے ان حالات کو پوری طرح سمجھا تھا اسی لئے انھوں نے آرزو کے چراغوں کو جلائے رکھنے، عمل کی راہ پر گامزن ہونے اور نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کا ایک پیام بھی دیا ہے۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں کھو جانے کے قائل نہیں۔ یہ سرمستیاں اُن کے خیال میں اب واپس بھی نہیں آسکتیں۔ اسی لئے وہ لذتِ خوابِ سحر سے اُٹھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اس شعر میں حالات کے بدلنے، پرانی زندگی کے ختم ہونے اور ایک نئی زندگی کے پیدا ہونے کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ غالب نے یہاں اس صورتِ حال کو سمجھنے، اس سے مطابقت پیدا کرنے اور عمل کی راہ پر آگے بڑھنے کی طرف توجہ دلائی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے پاس ایک واضح پیام موجود تھا۔

یہ افکار و خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب صرف اپنی ہی شکست کی آواز نہیں تھے۔ ایک معاشرت، ایک تہذیب، ایک نظام کی آوازِ شکست بھی اُن کی آواز میں شامل تھی اور یہ آوازیں آپس میں کچھ اس طرح مل جل گئی تھیں کہ بعض اوقات اُن کا پہچاننا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ لیکن غالب کی شخصیت اور ماحول سے دلچسپی لینے والے کو اُن کی اس مخصوص آواز اور لَے میں ایک اور ہی دنیا دکھائی دیتی ہے ٭

مختارالدین احمد

فغانِ بے خبر میں غالب کا ذکر

خواجہ غلام غوث بے خبر (۱۸۲۳ء – ۱۹۰۵ء) کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد خواجہ حضور اللہ بہ سلسلۂ تجارت نیپال آئے اور وہیں بس گئے۔ غلام غوث کی ولادت وہیں ہوئی لیکن تعلیم و تربیت بنارس میں ہوئی جہاں وہ بعد کو لفٹننٹ گورنر بہادر صوبہ شمالی و مغربی کے میر منشی مقرر ہوئے اور ۱۸۸۱ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

ادبی ذوق بہت پاکیزہ رکھتے تھے۔ فارسی شاعری کے متعلق ان کے دوست اور معاصر مرزا غالب لکھتے ہیں، "ایراع اس کو کہتے ہیں جدتِ طرز اس کا نام ہے جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے۔" اردو نثر کا اندازہ ان اردو رقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انھوں نے سپردِ قلم کئے ہیں اور جن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

غلام غوث بیخبر اور مرزا غالب کے تعلقات کب سے شروع ہوئے اس کا حال نہیں معلوم، لیکن یہ ضرور ہے کہ ۱۸۵۸ء سے پہلے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے، یہی زمانہ ان کی آپس کی خط و کتابت کے آغاز کا بھی سمجھنا چاہیئے۔ تعلقات اور خط و کتابت کا سلسلہ غالب کی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہا۔

بیخبر کی ساری تصانیف کو سامنے رکھا جائے تو تقریباً ہر ایک کتاب میں کچھ نہ کچھ مواد غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق ملے گا۔ مثال کے طور پر انشائے بیخبر میں غالب کے ایک قطعے سے متعلق بے خبر کی تفصیلی رائے ملتی ہے۔ منشی امین الدین، غالب کے مندرجہ ذیل قطعے سے متعلق ان کی رائے پوچھتے ہیں:۔

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی	روسوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات	عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

خواجہ صاحب اس پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں:

"عجیب خلط مبحث ہے، پہلے شعر کا تو یہ مطلب ہے کہ سلوک میں جب جیسی واردات ہو تو ویسا برتاؤ برتے، کیفیتِ سکر میں ہو تو میکدۂ بے خودی میں سر پائے خم پر رکھ دے اور حالتِ صحو میں ہو تو مناجات کرنے کو روبہ سوئے قبلہ ہو بیٹھے یہ متعلق بہ سالک ہے دوسرے شعر کے یہ معنی ہیں کہ تغیرِ صفات میں بھی ناظرِ جلوہ ذات رہے، تشبیہ، جو نقاب اور حجابِ شاہد تنزیہ ہے اسے نظارۂ ذات سے مانع نہ ہو۔ ہر صورت میں وہی حسن ہر ذرہ میں وہی چمک دیکھے۔ ... پہلے شعر کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے کوئی تعلق نہیں اور تقریر کے مساعد نہ ہونے سے مطلب خبط ہو جاتا ہے، مزید براں دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ کی بندش نے اور بھی معنی کو ژولیدہ کر دیا ہے، اُسے جو یوں کہا ہے: یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات یوں کہنا تھا:

پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو

دونوں شعروں کو باہم ربط تو اس سے بھی نہ ہوتا، مگر دوسرے شعر کے معنی صاف ہو جاتے۔ متقلدانہ اور عالمانہ کلام اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی اس کی شرح میں فکر کرے، غور و خوض کے لائق محققین کا کلام ہوتا ہے، یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو شاعر ہو وہ صوفی بھی ہو۔"

خواجہ صاحب کی تصانیف میں جو ہم تک پہنچی ہیں، خونِ نابۂ جگر

فغانِ بےخبر، رشکِ لعل و گوہر اور انشائے بےخبر ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں خواجہ کی اور تصانیف سے قطعِ نظر کرکے صرف فغانِ بےخبر میں غالب سے متعلق جو معلومات ملتی ہیں، انھیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

فغانِ بےخبر۔ ان کے اردو رقعات، تقریظوں، دیباچوں، خطبوں اور مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے جو مولوی امیرالدین کے اہتمام سے الٰہ آباد سے ۱۸۹۱/۱۳۰۹ میں شائع ہوا۔ اب اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔

(۱) فغانِ بےخبر میں غالب کے متعدد فارسی اور اردو شعر ملتے ہیں، بعض شعر تو بےخبر نے اپنے خطوط میں نگینے کی طرح جڑے ہیں۔ ان میں کوئی شعر غیر مطبوعہ نہیں اس لئے انھیں نقل نہیں کیا جاتا۔ یہاں اس امر کا ذکر صرف اس لئے کر دیا گیا کہ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے شعر ان کے زمانے ہی میں کس قدر مقبول اور مروج ہو گئے تھے کہ ان کے اہم معاصرین اساتذۂ قدیم کے اشعار کی طرح انھیں اپنے خطوط میں درج کیا کرتے تھے۔

(۲) اس کتاب میں غالب کے مندرجہ ذیل احباب اور تلامذہ کے نام خطوط ملتے ہیں:

عبدالرزاق شاکر (۸ خط)، نواب ضیاءالدین خاں رخشاں دہلوی (۲ خط) نواب مردان علی خاں رعنا (۲ خط)، ممتاز علی خاں میرٹھ (۳ خط)۔ بےخبر کے ان خطوں میں سے جو مندرجہ بالا اصحاب کے نام ہیں بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

مکتوب بےخبر بنام عبدالرزاق شاکر

"میرے عہدے کا تخفیف میں آنا، میرا خدانخواستہ ڈپٹی کلکٹر ہونا دونوں محض غلط ہیں۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو نائب تحصیل دار کیا تحصیل دار بلکہ ڈپٹی کلکٹر کر دیتا۔ مگر کیا کروں! نوکری کی اس زمانے میں جیسی قلت اور اس کے حاصل کرنے میں جیسی وقت ہے آپ بھی جانتے ہیں" ص ۱۶۱

بنام ضیاءالدین خاں رخشاں

[خواجہ صاحب نے پہلے خط میں رخشاں سے ان کی تصویر مانگی ہے۔ دوسرے خط میں تصویر بھیجنے کا شکریہ ادا کیا ہے جو درج ذیل ہے:]

"تسلیم شکریہ عرض کرتا ہوں کہ تصویر پہنچی، لفافہ کھولتے ہی جو چہرۂ انور پہ نظر پڑی بے اختیار پوچھ بیٹھا: مزاج مبارک! اور دیر تک فراق کی شکایت، اشتیاق کی حکایت عرض کرتا رہا۔ جب کچھ جواب نہ سُنا تو ہوش آیا اور دیکھا کہ آپ نہیں ہیں تصویر ہے، اب اس کی زیارت کے لئے ایک دن مجمع احباب قرار دوں گا۔"

ص ۲۵۸

بنام مردان علی خاں رعنا:

"حکومت اور امارت اور دولت مبارک ہو، کیا میں اس مژدہ سنانے کے لائق نہ تھا جو اوروں کو لکھ گیا اور مجھے نہیں، کیا احبابِ قدیم بھی تقویم پارینہ کے شمار میں آ گئے۔ خیر اب یہ فرمائیے کہ یہ جو مشہور ہے بہتے دریا میں ہاتھ دھو لو اس باب میں آپ کا کیا مشرب ہے۔ یعنی کسی کو آپ اپنی سرکار میں چھوٹی بڑی کسی طرح کی نوکری پر نوکر بھی رکھوا سکتے ہیں یا نفسی نفسی پر عمل ہے۔" ص ۱۳۶

بنام ممتاز علی خاں، میرٹھ

"حضرت سلامت، آپ کے پہلے خط میں کچھ آپ کا پتا اور نشان نہیں لکھا تھا۔ اس حیرت میں تھا کہ جواب کہاں بھیجوں۔ کل آپ کا دوسرا خط آیا گو مسکن کا پتہ اس میں بھی نہیں مگر اس سے اتنا معلوم ہوا کہ آپ آمادہ میں ریل بنانے کے کاریگر بن گئے ہیں ۔۔۔ میری عیادت کو نہ آنے سے آپ کے دشمنوں کو ندامت کیوں ہو، محبت ہوتی تو بےتابی کب وہاں رہنے دیتی۔ بے اختیار چلے آتے۔ جو لکھا ہے کہ گردن جھکا کر صفحۂ قلب پر تصویر دیکھ لیتا ہوں خدا ترقی عطا کرے۔ بعد اس کے وہ حال طاری ہو کہ گردن جھکانے کی تکلیف بھی جاتی رہے۔" ص ۱۰

(۳) اب ذیل میں خواجہ صاحب کے ان خطوں سے بعض ضروری اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مکتوب الیہ غالب کے سوا اور لوگ ہیں۔ لیکن ان خطوں میں غالب کی زندگی یا تصانیف سے متعلق کوئی نہ کوئی بات لکھی گئی ہے۔

منشی ممتاز علی، میرٹھ کے رہنے والے تھے اور مطبع مجتبائی کے مالک۔ غالب کی عودِ ہندی کا پہلا ایڈیشن انھیں نے شائع کیا تھا۔ چودھری عبدالغفور سرور

نے غالب کے رقعات جمع کئے اور ایک دیباچہ لکھا، بے خبر نے مزید خطوط حاصل کئے، کچھ غالب سے لئے اور کچھ کالپی، لکھنؤ، بریلی، آگرہ وغیرہ سے فراہم کئے۔ اصل خطوں کا نقل سے مقابلہ بھی کیا پھر انھیں مرتب کرکے، جلد بندھوا کر منشی ممتاز علی کے پاس طباعت کے لئے بھیج دیئے۔

بے خبر نے منشی ممتاز علی کو جو خطوط اس سلسلے میں لکھے ہیں۔ ان کے دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ابھی عودِ ہندی شائع نہیں ہوئی ہے، مسودّات کی ترتیب ہوگئی ہے بے خبر، مجموعے کو منشی ممتاز علی کے پاس بھیجتے ہیں اور یہ خط لکھتے ہیں:

"مرزا نوشہ صاحب کی نثر کا مجموعہ مرتّب کرکے آج منصف صاحب کے حوالہ کیا کہ غازی الدین حسین خاں کے پاس بھیج دیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ مصنّف آپ کے بہت قریب ہیں ایک نظر اون کو بھی دکھا دیجیے، تب چھپوانا شروع کیجئے تو بہتر ہے فقیر نے اس کی ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذاتِ خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردّد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے آپ نے کھو دیئے ان کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے گورکھپور، لکھنؤ، کان پور سے کچھ بہم پہنچایا اور تین نثریں مصنّف سے اور لیں اور ان سب کو بھی مجموعے میں داخل کیا اور جہاں کچھ شک ہوا مصنّف سے اس کی تصحیح کرلی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاقِ نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنّف پر احسان ہوگا، فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے لئے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوائے گا اور جو جو نقل کے طالب ہوں گے اُن کو دے دے گا۔"

ص ۸۵

عودِ ہندی مطبع مجتبائی سے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو شائع ہوجاتی ہے، غالب اسے دیکھ کر سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اُن کے احباب اسے کچھ اضافے کے ساتھ دوبارہ اُردوئے معلّیٰ کے نام سے شائع کردیتے ہیں۔ منشی صاحب کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں اور صورتِ حال جاننے کے لئے خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"عودِ ہندی یعنی مرزا غالب کے رقعات کا مجموعہ یہ تک پہنچا افسوس ہے کہ نہایت غلط چھپا۔ بہت جگہ غلطی سے مطلب خبط ہے۔ کہنے والے نے سچ کہا۔ دہلی میں یہ مجموعہ ترتیب اور نام بدل کر چھپا ہے۔ امیر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع نے چھاپا ہے۔ اردوئے معلّیٰ نام رکھا ہے۔ دو حصے قرار دئے ہیں۔ ایک حصہ جس میں رقعات ہیں مدّت ہوئی طیار ہوگیا دو دو روپیہ کو بکتا ہے۔ دوسرا حصہ جس میں متفرقات نثریں ہوں گی ابھی نہیں چھپا ہے۔ اردوئے معلّیٰ اور عودِ ہندی میں یہ فرق ہے کہ اکثر رقعے اِس کے اوس میں اور اوس کے اِس میں نہیں ہیں۔ دوسرا حصہ چھپ جانے کے بعد جو شخص ان تینوں کتابوں کو بعد حذفِ مکرر یکجا کرے گا وہ مجموعہ کامل ہوگا۔"

ص ۱۴۱ - ص ۱۴۲

عبدالرزاق شاکر، غالب کے تلامذہ میں تھے اور ان کے نام غالب کے متعدد خطوط اور اصلاحیں موجود ہیں، غلام غوث بے خبر غالب کی حیات کے آخری زمانے میں دہلی جاتے ہیں اور ان سے ملتے ہیں۔ اپنے تاثرات وہ عبدالرزاق شاکر کو اس طرح لکھتے ہیں:

"آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا خیال تھا کہ دہلی پہنچ لوں حضرت غالب سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت سب ایک ہی دفعہ لکھوں، اس کی حقیقت یوں ہے کہ چھٹی نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا رڑکی میں لشکر سے جا ملا۔ جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دہلی نہ جاویں گے میرٹھ پہنچ کر جو مقام کثرت سے ہوئے اور موقع ملا جی نہ مانا۔ دو روز کی رخصت لے کر دہلی گیا، احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا مزارات کی زیارت کرنی، دو دن میں کیا کیا کرتا؟ بہرحال وہاں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا فی الواقع اب وہ پیر فانی ہوگئے ہیں اور بڑی خفگی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں۔ عرصۂ دراز کے بعد ملاقات ہو، جی چاہے کہ بہت سی باتیں

کیجے۔ لکھنے ہیں بھلا کہاں تک لکھیے مگر ہوش و ہواس (کذا) بہت درست، شوخیِ طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم بخلاف مولوی صدرالدین خاں صاحب کے کہ ان کے حواس میں بھی فتور آگیا ہے"

۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ غالب کے تلامذہ اور احباب قطعات تاریخ اور مرثیے کہتے ہیں۔ مجروح کا قطعہ اور حالی کا مرثیہ کس نے نہیں پڑھا، عبدالرزاق شاکر بھی استاد کی وفات پر ایک قطعہ لکھتے ہیں اور خواجہ غلام غوث کو بھیجتے ہیں، خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"ہائے کیا کہیئے! مولانا غالب کا مرنا، اب تک یہ کلمہ زبان پر لانے کو جی نہیں چاہتا، آپ سچ فرماتے ہیں۔ کئی مہینے افسردگی کیا رہی۔ اون کے مرنے کا غم جیتے جی نہ جائے گا۔ تاریخ آپ نے کیا خوب کہی ہے، غزل بھی بہت اچھی فرمائی ہے۔ میں بہت محظوظ ہوا۔ اوس سخن فہم کو کہاں سے لاؤں کہ آپ کی شیریں سخنی کی داد دے۔ مگر اب کے دورہ میں دہلی جانا ہوگا، قبر پر پڑھ دوں گا تاکہ روح اون کی خوش ہو۔"

(۴) مرزا غالب نے جو خطوط خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھے ہیں وہ عودِ ہندی اور اُردوئے معلّیٰ میں موجود ہیں۔ ذیل میں غالب کے قدردانوں کی خدمت میں بے خبر کے کچھ خط پیش کئے جاتے ہیں جو انھوں نے مرزا غالب کی خدمت میں بھیجے تھے اور جن کی نقلیں انھوں نے اپنے مجموعۂ خطوط کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ یہ خطوط بے خبر کی زندگی ہی میں ان کے مجموعۂ نثر "فغانِ بے خبر" میں چھپ گئے تھے لیکن اس مجموعے کی کم یابی کے باعث ۷۷ سال کے بعد اب یہ خطوط دوبارہ شائع کئے جا رہے ہیں۔

ان سارے رقعات کے مکتوب الیہ مرزا غالب ہیں، ان کے مطالعہ سے مرزا اور ان کی بعض تصانیف کے متعلق کچھ نئی روشنی ملتی ہے، یقین ہے انھیں خاص دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اب ذیل میں وہ خطوط پیش کئے جاتے ہیں:

مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب غالب تخلص کے خط کا جواب

(۱)

حضرت

آج علی الصباح میں گورکھپور کے میدان میں خیمہ کے اندر اکیلا بیٹھا تھا، چکیں جو چاروں طرف کے دروازوں کی چھٹی تھیں، صاف قفس کی صورت تھی، ہر سمت کو دیکھتا تھا اور تنہائی سے گھبرا گھبرا کر یہ مصرع پڑھتا تھا

ہائے تنہائی اور کنجِ قفس

دفعتہً ہو بڑھو کا غل ہوا، حیرت میں آیا کہ کس کی سواری آتی ہے، دیکھا تو دیکھا کہ شوق اور تمنا اور محبت ان سارے حشم و خدم کا آگے آگے اہتمام ہے اور پیچھے اون کے حضرت توسن ہمت کو کدائے پھنداتے چلے آتے ہیں۔ پھر تاب کسے تھی بے اختیار دوڑا، خیمے سے باہر آیا، جھک کر آداب بجا لایا، رکاب تھام کر گھوڑے سے اوتارا، قدم لیے، خیمے میں لے گیا، مسند پر بٹھایا، صدقے میں اپنے کو اوتارا، دوزانو ادب سے سامنے بیٹھا، ہاتھ باندھ کر مزاجِ مقدس پوچھا، جواب میں علالت کی کیفیت، ضعف کی شکایت سنی۔ جی کڑھ گیا، نصیبِ دشمناں کہہ کر دعا دی کہ پروردگار ہمیشہ صحیح و سالم رکھے حضرت کی عمر اتنی بڑھائے کہ خضر کو رشک آئے۔ ادھر اودھر کا مذکور آیا۔ ارشاد ہوا کہ میں نے دہلی پہنچ کر تجھے ایک خط لکھا تھا عرض کیا کہ اوس کے ورود سے مشرف ہوا تھا۔ جواب لکھنے میں رام پور والے عریضے کے رسید کی راہ دیکھتا تھا۔ اس میں اس سوال کا ذکر آیا جو اوس عریضے میں ایک شعر کی نسبت لکھا تھا۔ حضرت نے فرمایا اوسی کو دیکھ رہا تھا کہ خاص تراشش آگیا اور حارج ہوا۔ یہ سن کر میں نے منہ بنا کر کہا اوس وقت میں نہوا ورنہ حجام کی خوب حجامت کرتا کہ اوس نے میرا حرج کیا۔ حضرت نے تبسم کر کے فرمایا اوس بے چارے پر کیوں خفا ہوتے ہو لو میں اب جاتا ہوں اور تیرے عریضہ کو دیکھ کر سوال کا جواب لکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت تشریف لے گئے، جب تک سواری نظر آیا کی میں دروازے پر کھڑا حسرت کی نگاہوں سے دیکھا کیا، پھر غمگین خیمہ میں آ کر بیٹھا اور یہ اشعار کسی کے جو برمحل یاد آگئے اونھیں پڑھ رہا ہوں۔

ایں نیست کہ از راہِ وفا آمدہ رفتی

شد راہ غلط ورنہ چرا آمدہ رفتی

چنداں دِ نشستی کہ شود غنچۂ دل وا
چوں بوئے گل و بادِ صبا آمدہ رفتی
چوں عمر کہ ہرگز بسر آید بہ رود زود
خود پرسیِ ایں بے سروپا آمدہ رفتی

الیضاً

(۲)

جناب عالی

پرسوں عنایت نامہ پہنچا، کل اخبار کا لفافہ آیا۔ میں ان دو نعمتوں کا ہزاروں شکر بجا لایا۔ اگر یاد ہو کہ آپ نے کسی زمانے میں کلکتہ تشریف لے جاتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ہوگا اس وقت یہ شہر خدا جانے کیسا ہوگا ع

ہمارے عہد میں اس پہ تو ویرانی برستی ہے

عجب طرح کا بشر ہے اُجڑے ہوئے گاؤں سے بدتر ہے، کسی فن کا کامل، کسی امر کا شوقین و مایل یہاں کوئی نظر نہیں آتا عملہ بیشتر لالہ صاحب، اور جو چند مسلمان ہیں انھیں کسی مذاق کا آشنا نہیں پاتا۔ کتاب کون خریدے، اخبار کون لے۔ رہا میں مجھے اردو کتابوں سے شوق نہیں، بوستانِ خیال فارسی ملے تو البتہ خریدار اور اخبار تو سرکاری اتنے آتے ہیں کہ مجھے انھیں کے دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے لکھا تھا کہ آپ ایک عرضی جناب کسی صاحب بہادر افسر مدارس کے حضور میں بھیج دیں اور اس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعۂ نثر کا ذکر لکھا ہے اُسے میں مرتب کرتا ہوں عنقریب چھپنا شروع ہوگا۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لئے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ صاحب تک ذکر پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا۔

جا بجا سے جو آپ کے خطوط جمع کئے گئے وہ اصل تو کہیں سے آئے نہیں نقلیں آئیں۔ سرور کے نام کے ایک خط میں

جلال اسیر کا ایک مصرعہ لکھا ہے وہ اسی قدر پڑھا جاتا ہے،

' زنجیرِ درِ شکر آب است '

بعد اس کے کیا جانئے کیا لفظ لکھا ہے۔

مارہرہ والوں کے خط کا حال تو آپ پر خوب ہویدا ہے، دوسرے لفظ ' پنشن ' کو کہیں مذکر لکھا ہے اور کہیں مونث، آپ تو اسے مونث کیوں بناتے مگر یہ خرابی بھی کاتب سے ہوئی ہے، ان دونوں کی تصحیح لکھیے تو کتاب میں صحیح لکھ دیا جائے۔

[غلام غوث، بے خبر]

(۳)

حضرت

نسخۂ عودِ ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا، کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں۔ خود سب کو دیکھا۔ جو مضامین لایقِ اعلان کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا۔ کاتب لکھ رہا ہے میں مقابلہ کرتا ہوں۔ اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے ادھر اگست کا آغاز ہو ادھر اس مجموعے کا انجام ہو۔ میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لئے ان کے حوالہ کروں۔ اس وقت بھی مقابلے میں مصروف ہوں۔ پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکا، میاں داد خاں صاحب سیاح ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے۔ آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے شاید وہاں سے بھی کچھ آ جائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آ دیں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کے نام

(۴)

جناب عالی

میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے اوس میں یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے اوس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے آج تک جواب نہ آیا کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو۔ جب ترکِ جواب حضرت کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجئے مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجئے۔

الحمد للہ کہ عودِ ہندی کی ترتیب تمام ہوئی، جلد بند ہوا کر آج ہی منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کردی۔ اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی، اونھیں اختیار ہے۔

(ایضاً)

(۵)

نہ ملی شام ہجر کے دن کو   شبِ غم کو عطا سحر نہ ہوئی

میں تیسری نومبر کو الہ آباد سے یہاں آیا، امید قوی تھی کہ اس ہنگامے میں کہ اکبر آباد تمام ہندوستان کے رئیسوں کا مجمع ہے آپ بھی بہ تقریب دربار یہاں تشریف لائیں گے۔ ایک عالم اشتیاق اور تمنا میں کاٹی ہے، چند روز لطفِ صحبت اُٹھائیں گے۔ ہر روز خبر لیتا رہا کہ دہلی سے کون کون آیا، کل جو حافظ زین الدین صاحب آئے مژدۂ امید کے بدلے خبر یاس لائے اون سے معلوم ہوا کہ حضرت کا ارادہ نہیں۔ کیا عرض کروں کیسی حسرت و افسردگی ہوئی اللہ اللہ ایک عالم اکٹھا ہو تو ہو مصیبت زدگانِ فراق باہم نہیں ہوتے

ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے   گو زمانے کو انقلاب رہا

(ایضاً)

(۶)

جناب عالی

پہلا عریضہ میرا پہلی جلد سبدِ چیں کی رسید میں ملاحظہ سے گذرا ہوگا۔ یہ دوسرا عریضہ دوسری جلد کے پہنچنے کی اطلاع میں لکھتا ہوں۔ دوسری جلد مع تصحیح نامہ پہنچی۔ شکرِ عنایت بجا لایا۔

حضرت یہ صحیح نامہ کیسا ہے مجھے تو اس میں غلطی کا شبہہ جا بجا ہے۔ صفحۂ آٹھواں سطر چودھویں کے خانۂ غلط میں 'دے' اور خانۂ صحیح میں 'دی' لکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نہ یہ ہے نہ وہ صحیح 'دے' ہے۔

صفحہ نواں سطر دوسری میں غلط 'امیر' صحیح 'اسیر' تحریر ہے۔ میری دانست میں غلط صحیح اور صحیح غلط ہے۔

صفحہ اونتالیس سطر گیارھویں میں غلط 'داؤ فرضا' اور صحیح 'داو ضا' مسطور ہے۔ میری سمجھ میں یہ دونوں لفظ نہیں آتے۔ غالب ہے کہ جو کتاب میں ہے وہی صحیح ہو، یا تو کثرتِ قصنیف سے میری قوتِ مدرکہ بھی ضعیف ہوگئی ہے کہ سمجھ نہیں سکتا یا صحیح نامہ غلط نامہ ہے۔ آپ ملاحظہ فرما کر میری تسکین فرما دیں۔

(۷)

جناب

اب کی آپ کی اور اپنی تحریر میں جو مجھے لطف آیا ہے کبھی نہیں آیا تھا۔ طرفین کے ضعف نے عجب کیفیت دکھائی ہے کہ نہ میرے مطلب کو آپ سمجھتے ہیں نہ آپ کے مدعا کو میں۔

میں آٹھویں صفحے کی چودھویں سطر کا حال لکھتا ہوں۔ آپ اس صفحے کی سترھویں سطر کو بتاتے ہیں، اور 'نازش' کا تو میں ذکر ہی نہیں کرتا آپ اسے کیوں داخل بحث فرماتے ہیں۔ اسیرا اور اسیر کی نسبت نویں صفحے اور دوسری سطر کے اس شعر میں گفتگو کرتا ہوں:

امروز میر ہند بود انجمن طراز
آنروز گشت شاہ نجف بر ہما امیر

میں اپنا عریضہ واپس بھیجتا ہوں اس کو اور صحیح نامہ اور سبدِ چیں کو انھیں صفحوں اور سطروں کے نشان سے ملا کر ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ میں کیا عرض کرتا ہوں۔

پہلے عنایت نامے میں جو آپ نے پوچھا ہے کہ تجھے کیا ہُوا تھا اور اب کیسا ہے۔ پہلے ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ ہیضہ ہُوا تھا اور اب اچھا ہوں۔ یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا محمد خاں صاحب مجھے اپنی اردو نثریں لے کر مجھے بھیج دیجیے۔ اس کا کچھ جواب ہی ارشاد نہ ہُوا۔

(۸)

حضرت

خدا گواہ اور محبت شاہد ہے کہ ہمیشہ آپ کے خطوں کے لئے اپنا جی تڑپا کیا۔ آخر آپ کو یہ لکھنا چاہا کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھ سے تو سلسلۂ تحریر قطع نہ کیجیے۔ اس محبت کو تا دمِ آخر نباہ دیجیے۔ لیکن آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے یہ سُنا کہ اب آپ نے اپنے خدام سے فرما دیا ہے کہ کوئی کاغذ ہو مجھے دکھایا ہی نہ کرو۔ اس سبب سے تحریر پر جرأت نہ کر سکا۔ دل پر جبر کر کے بیٹھ رہا۔ اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا نہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی۔ دولت ملتی سلطنت ہاتھ آتی تو بھی شاید اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اون چند سطروں کو بار بار پڑھا کیا، دیر تک ایک کیفیت قلب پر طاری رہی جو بیان میں نہیں آ سکتی۔ قسموں کی کیا حاجت ہے۔ اگر اتنا بھی معلوم ہو کہ میرے دس خط کا ایک جواب آئے گا تو حضرت کے دیوان خانے کا طاقچہ میرے خطوں سے بھر جائے گا۔ آپ کو نئے حاکم کا خیال کیا ہوگا۔ جو مساعدتِ روزگار سے استفسار ہے واقعی اون کی خاوندیوں میں شک نہیں مگر طالع تو وہی پُرانا ہے کیا عرض کروں میرے حال نے فلسفیوں کا کلیہ باطل کر دیا کہ باوجود حادث ہونے کے متغیر نہیں۔

اس سال روہیل کھنڈ کا دورہ ہوتا ہے کل تک لشکر رام پور کے علاقہ میں تھا۔ آج بریلی کی حد میں داخل ہُوا زندگی باقی ہے تو پانچویں فروری کو یہ دورہ ختم ہوگا اور الٰہ آباد پہنچیں گے میں جب الٰہ آباد سے مراد آباد لشکر میں شامل ہونے کو آتا تھا میرٹھ ہو کر آیا۔ وہاں منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے دکھائی سب چھپ گئی ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خان صاحب نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہدے اوسے پھینک رکھا ہے۔

مراد آباد میں اخبار جلوۂ طور کا مہتمم بھی وارد تھا وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی ناتمام پچیس ۲۵ جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔ میں نے خان صاحب کو لکھا تو ہے کہ قطعۂ تاریخ کا ہونا فرض نہیں یونہیں اوس صفحہ کو چھپوا کے کتاب تمام کر دیجیے دیکھیے خدا کرے کہ وہ مان لیں۔

(۹)

جنابِ عالی

کل میں ایٹہ میں تھا۔ مرزا حاتم علی مہر جو اپنے بیٹے کے اوس ضلع میں سررشتہ دار کلکٹری ہونے کے سبب سے بالفعل وہیں ہیں، میرے پاس بیٹھے تھے کہ ہرکارہ ڈاک کا آپ کا خط لایا۔ میں نے پڑھا اونھوں نے سُنا، دونوں نے لطف اوٹھایا۔ پہلا مجموعہ اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا بہت مناسب ہُوا، مگر گستاخی معاف۔ یہ نام اردوئے معلیٰ نہایت بھونڈا رکھا گیا۔ لالا صاحب یا بابو صاحب کی تجویز ہوگی۔ آپ نے اخلاق سے دخل نہ دیا ہوگا، آپ کی تصنیف اور ایسا بھدا نام لا حول ولا۔ اسے قبلہ قندِ ہندی نام رکھا ہوتا یا پھر سے جو چھپا ہے قندِ مکرر فرمایا ہوتا۔ یہ دونو نام کیسے شیریں تھے جب چھاپہ اتمام پر آئے اور قیمت قرار پائے تو مجھے اطلاع ہو، کچھ جلدیں میں بھی لوں گا۔

ان خطوط سے متعلق بعض ضروری باتیں لکھنی تھیں لیکن مضمون طویل ہو گیا ہے۔ اب انھیں آئندہ کسی فرصت کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

مسیح الزماں

غالب

غالب جاگیرداروں کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی نواب لوہارو کے یہاں ہوئی۔ اس طرح ان کی ابتدائی زندگی ناز و نعم میں گزری۔ رئیسوں کے یہاں عموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ اُن کے لڑکے جس طرح رہتے ہیں ویسا کوئی اور نہ رہے۔ اس طرح کی زندگی میں وہ ارد گرد کے لوگوں سے اپنے کو ممتاز اور بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ آل احمد سرورؔ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے:۔

> "زوال آمادہ شرفا میں جو جو باتیں ہوتی ہیں غالب میں سب موجود تھیں۔ دُنیا کے لذائذ سے متمتع ہونا، اپنی ذات کو آگے رکھنا، اپنی دنیا الگ بنانا غالب نے اپنے ماحول سے سیکھا۔" ؎۱

یہی وجہ ہے کہ ساری زندگی وہ اپنے کو دوسروں سے الگ رکھنے، تشخص اور امتیاز رکھنے کی دھن میں رہے۔ آخر عمر میں جب دہلی میں ایک وبا پھیلی تو اپنے مرنے کے متعلق ایک ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل عام ایسا! لوٹ ایسی سخت! کال ایسا پڑا! وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے۔
>
> ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ۔۔۔۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
>
> میاں ۱۲۷۷ ہجری کی بات غلط نہیں تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔"

یہ محض ایک شوخ فقرہ نہیں بلکہ اُس احساس کا ترجمان ہے جو ساری عمر ان کے دل کو اکساتا اور ان کی ذہنیت کو ڈھالتا رہا۔ اپنے سے بہتر فارسی جاننے والا انھوں نے کبھی کسی کو تسلیم نہیں کیا اور جب ہر طرف سے لوگ ان کے بتائے ہوئے محاورے اور تحقیق الفاظ کی سند مانگنے لگے تو انھوں نے ایک فرضی ملا عبد الصمد کو اپنا استاد بنا دیا۔ اسی فارسی دانی اور علاحدگی کے زعم میں انھوں نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا تو تخیل کی پرواز سے نئے مضامین فارسی ترکیبوں میں ادا کرنے لگے۔ اس شاعری میں احساس نہیں تھا۔ ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ صرف فارسی کے شاعر بیدلؔ کی تقلید سے اُردو میں ایک نئی معنویت اور نئے طرزِ سخن کی ابتدا مقصود تھی۔ اور جب اس نئے طرز کو لوگوں نے بے تکا، عجیب اور بے معنی ٹھہرایا تو ان کی وہی انانیت اس طرح ابھری ؎

> نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا ۔۔۔۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ بات تو غالب اپنی انانیت اور خود داری میں کہہ گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں ستائش اور صلہ کی سخت بھوک تھی۔ ملکہ وکٹوریہ سے اپنے کو کورٹ پوئٹ نامزد کرانے کی بے سود کوششیں، دہلی اور کلکتے کے معمولی انگریز عہدہ داروں سے لے کر گورنر، وائسرائے اور ملکۂ انگلستان کی شان میں زور شور کے قصیدے سب اس وجہ سے تھے کہ انگریزی سرکار ان کو بہادر شاہ ظفرؔ کا استاد اور نمک خوار نہ سمجھے بلکہ غدار اور خیر خواہ انگریز خیال کر کے خطاب اور سکوں کی ان پر بارش کر دے۔ اودھ اور دہلی کی سلطنتوں کا خاتمہ ایسا سخت جھٹکا تھا جس سے تمام ہندوستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اُبھر آیا تھا۔ غالب کو ان درباروں سے جو گہرا ربط تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اُس زوال کو وہ شدّت سے محسوس کریں اور اپنے ولی نعمت کی قید اور نظر بندی سے متاثر ہو کر بڑھاپے کی وجہ سے پیشۂ آبا اختیار نہ کر سکیں تو گوشۂ عزلت ہی اختیار کر لیں۔ اور

؎۱ نئے اور پُرانے چراغ صفحہ ۱۷۳ (دوسرا ایڈیشن)

کے قابلِ ذکر شاعروں میں فقط غالب ہی ایسے ہیں جو غدر کے فرو ہوتے ہی انگریزی حکومت پر دلی ست نکلے ہمک سجدہ ریز یاں کرتے نظر آتے ہیں" مکاتیبِ غالب" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صلے کی توقع کے آگے غالب پاسِ وضع کا خیال نہیں کرتے تھے۔

بیدل کے فارسی کلام میں ایک طرح کی پیچیدگی تھی۔ بات کو گورکھ دھندا بنا کر پیش کرنے کی کوشش، فکر کی رسائی اور خیال کی بلندی کے نام سے بات میں الجھاؤ پیدا کرنے کا طرز۔ غالب کو اپنے تشخص اور امتیاز کے لئے آسان طریقہ یہ نظر آیا کہ اس طرز کو اُردو میں رائج کرکے وہی درجہ حاصل کرلیں، جو ہندوستانی فارسی گویوں میں بیدل کا تھا۔ ایک تو زمانہ دوسرا تضاد دوسرے اُردو غزل کے مزاج کو انھوں نے اس وقت تک سمجھا نہیں تھا اس لئے نتیجے میں ایسے شعر ہوئے جن سے یہ بات تو ضرور واضح ہوتی ہے کہ غالب نے اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا وہ معنی کی جدّت کا ہے۔ مشکل قافیوں یا صنعتوں کو برت کر خراجِ تحسین وصول کرنے کی جانب وہ مائل نہیں ہوئے۔ لیکن اس رنگ میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے	آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی دامِ تماشا باختن	چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ	برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل	کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس	بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بیدل کی تقلید میں غالب نے صرف خیال کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی فارسی دانی کے زعم میں ایسے اشعار کہے جو صرف رسماً و اخلاقاً اُردو کہے جا سکتے تھے۔ اس لئے اس پر جب اُن کی ہنسی اُڑنے لگی تو انھوں نے اپنے اندازِ کلام میں تبدیلی کی۔

ہر پیشے یا کام کی ابتدا میں آدمی کو اپنی اہمیت کا غیر معمولی احساس رہتا ہے جو بعد کو تجربے سے، اعتدال پر آتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے انحطاط سے فارسی کا زور گھٹ رہا تھا کیا اودھ اور کیا دہلی، رام پور، پٹنہ، کلکتہ، دکن ہر طرف اُردو کی شوخ نگاہی نے پیرِ فارسی کو گوشہ نشینی پر مجبور کردیا تھا۔ اس لئے غالب بھی گیسوئے اُردو کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوئے اپنے کو اوروں سے الگ رکھنے کی خواہش نے زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے مل کر ان کی انفرادیت کو جنم دیا۔ یہ جدّتِ خیال اور طرزِ بیان دونوں میں جلوہ گر ہے۔

جدّتِ خیال

غالب کی طبیعت تفکر کی طرف مائل تھی وہ ہر چیز کے متعلق سوچتے، غور کرتے اور اس سے نتیجے نکالتے تھے۔ ہوسکتا ہے ان کو راستہ ملتا تو وہ فلسفی ہو جاتے۔ لیکن ان کے موجودہ کلام میں نہ کوئی مخصوص نظریۂ زندگی ہے جسے فلسفہ کا نام دیا جا سکے۔ نہ اُن کی شاعرانہ طبیعت کسی فلسفہ کا بار اٹھا ہی سکتی تھی۔ پھر بھی انھوں نے صرف وصل و فراق کی داستانیں بیان کرنے یا محاوروں اور صنعتوں کو خوبی سے نظم کرنے کو کافی نہیں سمجھا۔ زندگی اور کائنات پر ان کی نظر پڑتی تھی۔ جا بجا ان کے اشعار میں ایسے فکری عناصر ملتے ہیں جو تصوف کے مروّجہ خیالات سے الگ ہیں۔ ان کی بنا پر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو غزل میں تفکر غالب کا مرہونِ منت ہے اس تفکر میں استعارے یا تشبیہ کی لطافت شعر کی دلکشی بڑھا دیتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ	دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
نغمہ ہائے غم ہی کو اے دل غنیمت جانیے	بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے	نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اہلِ بینش کو ہے، طوفانِ حوادث مکتب	لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج	مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غالب کے اسی رنگ نے بیسویں صدی کی اُردو غزل کو حیات و کائنات کی حقیقتوں کی طرف موڑا۔ فانی، ثاقب، فراق کو راستہ غالب ہی نے دکھایا ہے۔ اقبال کی غزل میں بھی فکر و خیال کے بہت سے گوشے ہیں لیکن وہ غالب کا براہِ راست اثر نہیں۔ غالب کے معاصرین میں نصیر، مومن، ذوق، ناسخ، صبا، وزیر، شیفتہ سب حالات کو ناموافق دیکھ کر شاعری میں پناہ لیتے تھے۔ شعر کہہ کر اپنا غم غلط کرتے تھے جو سماجی انحطاط کی وجہ سے ان پر طاری تھا۔ نئے قافیے باندھ کر محاورے نظم کرکے یا سادگی سے کسی مضمون کو ادا کرکے خوش ہوتے تھے۔ نیرنگ روزگار یا فلک کج رفتار کا ذکر بھی کرتے تو یہ ضرور ظاہر ہو جاتا کہ اپنی موجودہ حالت سے پریشان ہیں لیکن وہ سب قسمت کا لکھا اور تقدیر کہہ کر رُک جاتے ہیں۔ فکر کی طرف مائل نہیں ہوتے شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ ان کی زیادہ توجہ زبان کی صفائی کی طرف رہتی تھی مثلاً وزیر کی مشہور غزل ہے ؎

چلا ہے لے دلِ راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر	زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

یا ناسخ لکھنوی کا کلام دیکھئے ؎

دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے	وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

پھولا ہی بھلا چھوڑ کے اُٹھ جاؤں چمن کو   اللہ دکھائے مجھے عالم نہ خزاں کا
فلک کے ہاتھ سے جس سرزمیں پر بھاگ کر پہنچا   یہی واں بھی زمیں پائی یہی واں آسماں پایا

غالب بھی اپنے ماحول کے انتشار سے پریشان ہیں لیکن ان کی پریشانی اور ان کے معاصرین کی پریشانی میں یہ فرق ہے کہ وہ پریشان ہو کر حالات کے متعلق سوچتے بھی ہیں۔ ان کو انتشار کے احساس کے ساتھ اس کا بھی شعور ہے کہ جس معاشرتی نظام میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ زیادہ چلنے والا نہیں۔ مہرے پٹ گئے ہیں بساط الٹ ہی جائے گی۔ اس لئے وہ زندگی کے ہر پہلو پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہیں۔ غم کا احساس ان کے دل میں شدید ہو جاتا ہے۔

ہو نہ نقد داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی   تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا   کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی
حالاں کہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ   غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا   کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں   ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے   ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ   اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا   نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

وہ اپنی طبیعت کے زور میں کبھی کبھی اس غم سے تسلی حاصل کرنے اور اس پر فتح پانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان سیاہ بدلیوں میں بجلی کی چمک ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس   برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

لیکن ناسازگار حالات کا زور شور ایسا ہے، ان کے غم و الم اتنے ہیں کہ مایوسی اور لذتِ غم کے اندھیرے میں بھٹکنے کے علاوہ انھیں کوئی راستہ نہیں ملتا۔ کبھی یہ اعتراف شکست کی صورت میں یوں ظاہر ہوتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
نغمہ ہائے غم ہی کو اے دل غنیمت جانیے   بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اور کبھی یاس و ناامیدی سے انھیں سارا عالم تاریک نظر آتا ہے۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے   میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی
ہم ناامیدی ہمہ بدگمانی   میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل   انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے   سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز   دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ   صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا
جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی   نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے

پروفیسر احتشام حسین نے غالب کے اس نقطۂ نظر کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ

> "غالب شاہی اور جاگیردارانہ نظام کو اپنی نگاہوں کے سامنے مٹتے ہوئے دیکھ کر طرح طرح سے متاثر ضرور ہوتے تھے۔ لیکن نہ تو اس کے اسباب کا اندازہ لگا سکتے تھے اور نہ نتائج کا۔ ان کا ذہن فضا کی ساری مایوسی اور بے دلی اپنے اندر جذب کر رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس بے دلی سے باہر نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے یا نہیں۔"[1]

غالب کی یہ مایوسی یقیناً اس وجہ سے ہے کہ وہ آسودہ اور مطمئن نہیں تھے لیکن اس نظام کی اخلاقی قدروں کے وہ ایسے پابند تھے کہ اپنے کو اس سے الگ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے طبقے کے اخلاق کے شکنجوں کو توڑ دینا اُن کو نقصان دہ بھی کر ان سے علاحدہ ہو جانے کی بھی ہمت کرنا، وضع داری کو نظر انداز کر دینا بڑی جراءت کا کام ہے اور یہ جراءت غالب میں نہیں تھی۔

اوپر جس طرح کے اشعار پیش کئے گئے ہیں ان سے اور اسی طرح کے دوسرے اشعار سے لوگ غالب کو بڑا فلسفی اور صوفی بھی قرار دیتے ہیں لیکن جن لوگوں نے غالب کے کلام کو غور سے دیکھا ہے وہ آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ نہ ان کا کوئی مخصوص نظریۂ حیات ہے جسے وہ اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہوں نہ صوفیانہ مسلک پر کاربند ہونے کی انھوں نے کوشش کی اس لئے نہ وہ فلسفی ہیں اور نہ صوفی

---

[1] تنقید اور عملی تنقید

اپنے عہد کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح ان کو بھی تصوف سے علمی طور پر دلچسپی تھی فارسی اور اردو غزل میں تصوف کی ایک روایت بھی تھی اور دہلی کے سماجی ماحول نے اسے اپنا بھی لیا تھا اس کے علاوہ جن افسردہ طبیعت لوگوں کو ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا وہ تصوف ہی کا سہارا لیتے ہیں اس لئے غالب نے بھی تصوف کے مضامین نظم کئے ہیں۔ جن میں اندازِ بیان کی جدت سے جان پڑ گئی ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد یاں

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

نفسیاتِ انسانی پر عبور

اپنے مزاج اور اپنے ماحول کی کشمکش میں گرفتار ہونے کے علاوہ غالب سماج کے ایک فرد کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ فرد سماج کی چار دیواری میں محصور ہونے کے باوجود ذاتی احساسات رکھتا ہے۔ معمولی انفرادی خوشیوں سے مسرور اور غموں سے مغموم ہوتا ہے۔ ناسازگار ماحول میں بھی کبھی امید کی ٹمٹماتی لو اس کے افق کا جگمگاتا سورج بن جاتی ہے۔ وعدۂ فردا کا حسین جال اس کی نظروں میں لالہ زار کھلا دیتا ہے کوئی دلنواز قہقہہ کانوں میں شہنائیوں کی طربناکی اور جل ترنگ کی گنگناہٹیں بھر دیتا ہے۔ غالب نے بھی فرد کی حیثیت سے زندگی گزاری تھی۔ نگاہیں ملائیں اور دل کی دھڑکنیں گنی تھیں۔ پنشن، دشمنی، ریاست، دربار اور طنز وغیرہ سے دوچار ہوئے تھے۔ نفسیاتِ انسانی کی بہت سی باریکیوں تک ان کی نظر پہنچی تھی۔ شاعری کی ابتدائی مشکل پسندی کو چھوڑ کر انھوں نے احساسات کی ترجمانی پر توجہ کی۔ اس میں ان کی نباضی اس قدر مہارت سے ظاہر ہوئی کہ مشکل پسندی کے باوجود ان کے اشعار میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہے۔ احساساتِ انسانی کی جھاڑیوں اور جنگلوں میں ان کے اشعار ایسی پگڈنڈیاں ہیں جن کو سمجھ کر چلنے والا بصیرت کے انمول خزانوں تک پہنچ سکتا ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہوئے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

یہی مشاہدہ اور یہی ترجمانی جب سادگی کا جامہ پہن لیتی ہے تو "عالمِ تکاد" ہو جاتی ہے۔

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ان مثالوں میں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ تجربے اور مشاہدے کے بیان میں بھی غالب کے یہاں سپردگی یا کسک نہیں ہوتی۔ وہ شدتِ احساس میں کھو نہیں جاتے۔ ان کے عشق میں نہ عالمِ حیرت آتا ہے اور نہ خود فراموشی۔ بے خودی کا انھیں سہارا درکار ہوتا ہے تو وہ شراب کی مدد لیتے ہیں۔ اسی لئے نفسیاتِ انسانی کی جب وہ تصویر کشی کرتے ہیں تو ان کا فکری انداز قائم رہتا ہے یعنی وہ جذبات کی شدت کو بیان نہیں کرتے کیونکہ اس کوچے میں وہ میر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ان کے مزاج میں وہ قناعت وہ گوشہ نشینی یا دولت و امارت کی طرف سے وہ بے نیازی تھی نہ عشق کی وہ سرشاری جو میر کا حصہ تھی۔

غالب اپنے کو عشق میں بھلا نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں احساساتِ محبت کی تصویر کشی ہے تو اس میں بھی سوچنے کا انداز ہے۔ جیسے بات میں بات پیدا

کی گئی ہو۔ سوچ کر اس میں نیا پہلو پیدا کیا گیا ہو۔ مگر یہ سوچ ان کو غلط راستے پر نہیں لے گئی۔ انھوں نے وہ انداز اختیار نہیں کیا جسے لکھنؤ اسکول معنیٰ آفرینی کے نام سے یاد کرتا ہے کیونکہ زندگی کی نبض پر ان کی گرفت مضبوط تھی نفسیاتی حقائق ان کے پیشِ نظر تھے۔ دل کی دھڑکنیں ان کی رہنما تھیں۔

ظرافت اور رجائیت

غالبؔ کے مزاج میں حالات سے فائدہ اٹھانے اخراب نہ ملے تو درد تہ جام ہی سے لطف اندوز ہونے کی خصوصیت بھی تھی۔ کل کے لئے آج بچا رکھنا ان کو نہیں آتا تھا۔ پاسبانِ یار سے دوستی کا رشتہ قائم کر کے اس کے سب و شتم کو ٹال جانا دوست کی شکایت میں دشمن کو ہم زبان کر لینا۔ رقیب کے در پر شوقِ دیدار میں چلے جانا۔ حالات سے مصالحت کرنا ان کو آتا تھا۔ اس لئے جب وہ اپنی شکست کے احساس سے آزاد ہو کر ناامیدی کی دنیا سے نکلتے تھے تو ان کی نگاہ کا دامن گلزار اور زعفران زار بھی بن جاتا تھا۔ ان کے خطوط کی شگفتگی، دوستوں اور شاگردوں سے ہنسی، مزاج کے اسی پہلو کے جلوے ہیں۔ جو ان کی غزلوں میں شوخی، خوش باشی اور شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ وہ طبعاً غم پسند نہیں ہیں۔ مگر جب ان کی چوٹ کھائی ہوئی انانیت بے بس ہو جاتی ہے تو ضرور ساری دنیا کو تاریک دیکھنے لگتے ہیں لیکن یہ مزاجی کیفیت جب بدل جاتی ہے تو وہ اپنے اوپر ہنس بھی سکتے ہیں:

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس لئے ان کے کلام میں ایک ولولہ بھی ہے نئی طرف بڑھنے کا، امکانات سے مایوس نہ ہونے کا اور حرمِ کعبہ اگر کھلا نہ ملے تو پلٹ آنے کا کیونکہ اس واپسی میں پسپائی نہیں خود اعتمادی ہے:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

ایک شاعر یا فن کار کی بلندی اس جمالیاتی احساس، اس تخلیقی صلاحیت اس کی لپک میں ہے جو اسے اپنی شخصیت کے اظہار پر مجبور کرتی ہے۔ اس عظمت میں طریقِ اظہار کو بڑی اہمیت حاصل ہے باکمال مصور جس رنگ کو چاہے لے کر تصویر میں وہی بات پیدا نہیں کر سکتا جو اس کی مصوری کو کاریگری سے اٹھا کر فن کاری کے درجے تک پہنچا دیتی ہے بلکہ اس کے فن کی بلندی میں رنگوں کا انتخاب، اس کا مناسب امتزاج ان کی شوخی اور ہلکا پن بڑا اہم حصہ رکھتا ہے۔ جس طرح ایک مصور کی فن کاری کمال کو پہنچنے کے لئے اس کی محتاج ہے کہ وہ مناسب رنگوں کا انتخاب بھی کرے اسی طرح شاعر بھی طریقِ اظہار کا پابند ہے۔ اپنے خیال کو، اپنے احساس کو اپنے تجربے کو اگر وہ مہارت اور چابک دستی سے شعر کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا اس میں کیف و اثر کی ہلکی ہلکی لہریں نہیں دوڑا سکتا تو وہ کامیاب نہیں ہے۔ غالبؔ کے ذہن اور ان کے اندازِ فکر کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لئے بھی اپنا الگ سانچہ، الگ انداز رکھا جس میں ہر جگہ وہی سوچی ہوئی بات کا طور ہے وہ عام مضامین جو شاعری میں رائج ہیں۔ وہ خیالات جو عام ہیں ان کو بھی وہ بیان کرتے ہیں تو ان کو ایک نیا پہلو دے دیتے ہیں اس کا ایسا رخ دکھا دیتے ہیں جس پر ہماری نظر نہیں گئی تھی۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

غالبؔ میرؔ کی طرح صرف احساس کے عکاس نہیں، وہ احساس کو فکر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ ان کو خیالات کے نسبتہً لمبے سلسلے کو دو مصرعوں میں بند کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ مجبور ہیں کہ معنویت بڑھانے کے لئے پھیلے ہوئے سلسلۂ خیال کو سمیٹنے کے لئے اپنی ترکیبیں استعمال کریں چاہے وہ اپنی بنائی ہوں یا فارسی میں رائج۔ جن سے شعر میں ان کے مفہوم کی سمائی ہو سکے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کے بہت سے اشعار پیچیدہ اور بعض مبہم ہو گئے ہیں۔ لیکن غزل کا صفائیِ زبان سے ہٹا کر فکری انداز کی طرف موڑنا ایک بڑا کام ہے جو غالب کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جس میں ادب کے بہت سے طالب علم گرفتار نظر آتے ہیں۔ دیوانِ غالب کی آخری غزل کا ایک شعر ہے:

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

اس کو اس جگہ سے ہٹا کر پڑھا جائے تو یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ غالب نے غزل کی تنگ دامانی محسوس کر لی تھی اور اس سے نکلنا چاہتے تھے۔ یہی سمجھ کر اور یہ سوچ کر کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ الگ ہوتا ہے بعض ذمہ دار لوگوں نے غزل کے خلاف غالب کی تائید سے کر بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ اس شعر کے کہنے کے وقت نہ غالب کو غزل کا سانچہ اظہار مطالب کے لئے ناکافی معلوم ہوا تھا نہ انھیں زندگی کے نئے تقاضوں کا احساس تھا جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں پیدا ہونے والے تھے۔ یہ شعر تو گریز کا شعر ہے۔ جب شاعر غزل کہتے کہتے ممدوح کی تعریف کی طرف بڑھنا چاہتا ہے اور یہ محسوس کرے کہ وہ غزل کی حدیں چھوڑ کر قصیدے کی سرحد میں قدم رکھ رہا ہے معذرت کرتا ہے۔ غزل کے دوسرے اشعار سے یہ شعر مربوط ہے:۔

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

غالب نے مثنویاں اور قصیدے لکھے ہیں، رباعیاں بھی کہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انیس سے متاثر ہو کر مسدس میں مرثیے کے تین بند بھی لکھے تھے۔ جن کو دیکھ کر آگے لکھنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اگر یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو مسدس، مثلث، مربع، مسوخت، ریختی، ہجو، شہر آشوب وہ جس صورت اور جس صنف میں چاہتے لکھ سکتے تھے۔ ان پر کسی نے غزل کہنے کی پابندی نہیں لگائی تھی۔

یہ بات تو بیچ میں نکل آئی ہم کہہ یہ رہے تھے کہ غالب نے اردو غزل کو ایسا اندازِ بیان دیا جس میں غور و فکر کے عناصر ملے جلے چلتے ہیں۔ انھوں نے دکھا دیا کہ غزل کی ترقی کا راستہ یہ نہیں ہے کہ محدود مضامین میں تخیل کی موشگافیوں اور مبالغے کی انتہا کا مظاہرہ کیا جائے بلکہ اس میں گہری معنویت وزن اور وقار پیدا کرنا چاہئے۔ غالب کی ترکیبیں اور تشبیہیں بھی مقصد پورا کرتی ہیں۔ خود داریِ ساحل، فردوسِ گوش، خانہ ویرانیِ نگہ، دیدۂ تصویر، لذتِ سنگ، موجِ آئینہ داری، چراغانِ سرِ رہگذرِ باد، نشۂ رنگ، سادہ پُرکار، شوقِ منفعل، سوزِ غم ہائے نہانی کی ایسی کتنی ہی ترکیبیں دیوانِ غالب میں بکھری ہوئی ہیں۔ غالب کی انوکھی تشبیہوں کی ایک لمبی فہرست اردو کے پرستار عبدالرحمٰن بجنوری نے "محاسنِ کلامِ غالب" میں دی ہے ان میں چند یہ ہیں۔

بہار کو حنائے پائے خزاں، جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل، دامِ موج کو حلقۂ صد کامِ نہنگ، تابِ اشک کو رشتۂ چشمِ سوزن، دریا کو زمین کا عرقِ انفعال کہنا انھیں کا حصہ ہے۔

۸-دسمبر ۱۹۵۶ء کو دہلی میں ایک یادگار ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں وزیرِ داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت نے پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کو اُن کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک ابھینندن گرنتھ (صحیفۂ سپاس) پیش کیا۔

جوش صاحب نے ۱۸۹۵ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا پہلا شعر یہ ہے ؎

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں   فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہ کتاب ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، بخشی غلام محمد، دیگر اکابرِ ملک اور مشہور ادبا و شعرا کے پیغامات شامل ہیں۔ سفیرِ ایران ہز ایکسیلنسی علی اصغر حکمت نے جوش صاحب کی خدمت میں اپنی دو تصنیفات پیش کیں۔ تصویر میں پنڈت پنت جوش صاحب کو ابھینندن گرنتھ پیش کر رہے ہیں۔

غالب کے

مرزا ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی

ضیاء الملک مصور

فی زمانہ ہماری شہر دہلی مین عالی جناب نواب
ضیاء الدین احمد خان خلف الصدق فخر ال
نواب احمد بخش خان بہادر مرحوم کی ذات
بابرکات سی بڑی رونق ہی اوصاف حم
بیرون از تحریر اور اخلاق پسندیدہ خا
از تقریر ہین فن شاعری مین لاثانی
فصاحت و بلاغت مین ثانی خاقانی ہین
فکر انکی مثل ملایک آسمان پیما ہی اور اندیشہ
مانند دعائی مستجاب کے تاعرش رسا علم تواریخ
دستگاہ کامل ہے مورخان جہان کو انکی
ذات بابرکات سے فیض حاصل ہے ۔

نواب محمد یوسف علی خاں ناظم رامپوری

شاگرد

ب سعید الدین احمد خاں صاحب نصنا بہادر میس لی

ہمارے جناب نواب

یاءالدین احمد خان صاحب

ر کے بڑے صاحبزادہ والاشان

ج شرافت شمع شبستان مروت

بزم ثروت نواب سعید الدین احمد

ن صاحب بہادر ہیں ۔

نبیہ عنوان صفحہ پر درج ہے فصاحت

نیں طاق خلق و مروت میں شہرۂ آفاق

میرزا مہدی مجروح

میر مہدی حسین مجروح دہلوی

منشی شیو نراین آرام اکبر آبادی

نواب علی بہادر باندہ

غالب نے آپ ہی سے متعلق یہ شعر کہا تھا ؎

غالبؔ! خدا کرے، کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گُہر کو میں

آپ سے متعلق مالک رام صاحب کا مضمون صفحہ ۲۳ سے صفحہ ۳۳ تک ملاحظہ فرمایئے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ نے انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرم معرکہ آرائیاں کیں۔ منیرؔ شکوہ آبادی آپ کے دربار سے متعلق تھے۔ مہاراجہ بنارس کے مہمان تھے کہ وہیں فالج کا حملہ ہُوا اور جانبر نہ ہوسکے۔ بنارس ہی میں فاطمین میں مدفون ہوئے۔ منیرؔ نے تاریخِ وفات لکھی :-

نواب علی بہادر اے بحرِ کرم — یوسف طلعت شجاع یکتا ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردارِ منیر — اے اہلِ سخن کے عزّت افزا ہے ہے
اے صدر نشین خلق و اقبال و شکوہ — اے بزمِ کرم میں مسند آرا ہے ہے
اُٹھ جائے جوان تو زمانہ سے ہائے — صد حیف افسوس وادریغا ہے ہے

تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے منیرؔ
فیاضِ زماں امیرِ زیبا ہے ہے
۱۲۹۰ ھ

مالک رام

نواب علی بہادر خاں (باندہ)

ہندستان کی تاریخ میں پیشوا باجی راؤ اول کی جو اہمیت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر مرہٹوں کا عروج بہت حد تک اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وہ جب اپریل ۱۷۲۰ء میں اپنے والد بالاجی کی وفات پر شاہو اول (پسر شیواجی) کا پیشوا بنا ہے، تو اس کی عمر مشکل سے ۱۹ برس کی ہوگی۔ رگوں میں جوانی کا خون اور طبیعت میں جاہ پسندی کا ولولہ، اس نے اپنی جارحانہ فوجی پیش قدمیوں سے ہر طرف ہل چل ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ دس برس ہی میں مرہٹہ سلطنت، وسطِ ہند کی حدود سے نکل کر شمالی ہندستان کے بڑے وسیع رقبے پر قابض ہوگئی۔

۱۷۲۹ء میں اس نے بندھیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ نواب محمد خاں بنگش نے راجہ چھتر سال بندیلہ راجپوت کو جیت پور میں گھیر لیا۔ راجہ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن مخلصی کی کوئی صورت نظر آئی۔ آخر اس نے پیشوا کو مدد کے لیے لکھا۔ باجی راؤ نے اس کی درخواست منظور کی اور فوج لیے منزلیں مارتا ہوا آن پہنچا۔ محمد خاں نے دیکھا، کہ مقابلہ سخت ہے، تو اس نے شاہِ دہلی سے کمک کی درخواست کی۔ بادشاہ سلامت نے محمد خاں کے بیٹے قایم خاں ہی کو فوج دے کر روانہ کیا۔ باجی راؤ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس نے قایم خاں کو راستے ہی میں روک لیا، تاکہ باپ بیٹے کا گٹھ جوڑ ہو ہی نہ سکے لیکن اس اثنا میں چھتر سال بنگشوں کے دباؤ کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس طرح قلعہ (جیت پور) محمد خاں کے قبضے میں آ گیا۔ باجی راؤ، قایم خاں سے فارغ ہو کر دوبارہ محمد خاں کے مقابلے میں آ ڈٹا۔ محمد خاں جیت پور میں قلعہ بند ہو گیا تھا، لیکن مرہٹوں نے محاصرہ کر کے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ آخر کار رسد ختم ہو جانے کے باعث محمد خاں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ شرط یہ ٹھہری، کہ آئندہ محمد خاں کبھی بندھیل کھنڈ کا رخ نہیں کرے گا۔ نہ چھتر سال سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرے گا۔

بادشاہِ دہلی کو جب معلوم ہوا کہ محمد خاں نے یوں دب کے صلح کر لی ہے، تو وہ سخت ناراض ہوا اور اس نے اسے الٰہ آباد کی صوبہ داری سے الگ کر کے، اس کی جگہ سربلند خاں کو مقرر کر دیا۔

راجہ چھتر سال نے اپنی ممنونیت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔ اس نے پیشوا کے اعزاز میں ایک شاندار دربار منعقد کیا اور اپنے علاقے میں بہت بڑی جاگیر اس کو دی۔ اس نے اپنے دونوں خورد سال بیٹوں (جگت راج اور ہیردیسا) کا ہاتھ بھی باجی راؤ کے ہاتھ میں دے دیا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ ہمیشہ ان کی حفاظت کرے گا۔ اور ان سب پر مستزاد، اس نے اسی موقع پر باجی راؤ کو مستانی بطور تحفہ پیش کی۔

مستانی کون تھی؟ اس سے متعلق مختلف روایتیں ہیں[1] لیکن اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس کا باپ ہندو اور ماں مسلمان تھی اور وہ خود بھی اسلام کی پیرو تھی۔ گانا اور ناچنا اس کا پیشہ تھا اور وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ سب مورخ اس پر متفق ہیں کہ یہ فتنۂ روزگار اور قیامتِ عالم اپنے زمانے کی حسین ترین عورتوں میں سے تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ تاریخ محمد شاہی[2] کے مطابق "وہ شہ سواری

---

[1] "مستانی" سے متعلق ایک مستقل مضمون وسنت دینا ناتھ راؤ نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کے دسمبر ۱۹۴۴ء کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ یہ اس سال کی جلد (نمبر ۲۱) میں شامل ہے۔ اسی سلسلے میں جی۔ ایس سردیسائی کی کتاب New History of Marathas. جلد دوم کا ص ۱۷۸-۱۷۹ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

[2] بحوالۂ سردیسائی: جلد دوم، ص ۱۷۸

اور نیزہ بازی اور تلوار زنی میں بھی طاق تھی۔ وہ باجی راؤ کی فوجی مہموں اور سرگرمیوں میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی۔" ان صوری و معنوی خوبیوں کے باعث باجی راؤ دل و جان سے اس کا والہ و فریفتہ ہوگیا اور اس کا زیادہ وقت اس کی صحبت میں گزرنے لگا۔

پیشوا کا خاندان قدامت پسند برہمنوں کا تھا۔ ایک مسلمان عورت سے اس کے تعلقات ہی بجائے خود کچھ کم قابلِ اعتراض نہیں تھے، اس پر ستم یہ تھا کہ اس نے مستانی کی صحبت میں گوشت کھانا اور شراب پینا بھی شروع کر دی۔ اس سے ہر طرف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور پورا خاندان اس کے خلاف ہوگیا لیکن اس کی سطوت اور جبروت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی سب دم بخود موقع کی تلاش میں تھے۔

۱۷۳۹ء میں باجی راؤ، نواب ناصر جنگ کے خلاف مہم پر باہر چلا گیا۔ مستانی اس کے ساتھ نہ گئی اور پونا ہی میں رہی۔ "زور بر عضوِ ضعیف" کے مصداق مخالفوں کو اپنا غصہ مستانی پر نکالنے کا موقع مل گیا۔ وہ پیشوا کی گمراہی اور اس کی خلافِ مذہب حرکات کے لئے مستانی کو ذمہ دار گردانتے تھے۔ باجی راؤ کے بیٹے نانا صاحب اور بھائی چیما جی آپا نے مستانی کو گرفتار کرکے قید کر دیا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل جائے۔ چنانچہ انھوں نے چھترپتی شاہو سے اجازت مانگی، کہ مستانی کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن شاہو اس پر رضامند نہ ہوا اور اس طرح اس کی جان بچ گئی۔ لیکن وہ بدستور قید ہی میں رہی۔

پیشوا کو بھی یہ سب خبریں دم بدم پہنچ رہی تھیں۔ مستانی سے اسے جو عشق اور روحانی لگاؤ تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سب کام چھوڑ کے فوراً اس کی مدد کو پہنچتا۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ واپس چلا آتا تو مہم کی ناکامی یقینی تھی۔ پھر شاہو کی اجازت کے بغیر واپسی سرکشی کے مرادف ہوتی۔ خاندان کی مخالفت اس کے علاوہ۔ آخر اس کے خاندان نے اپنا ایک نمائندہ اس کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اسے مستانی سے قطع تعلق کر لینے پر آمادہ کرے۔ بھلا وہ اس تجویز پر کس طرح رضامند ہو سکتا تھا! لیکن مستانی کی مسلسل نظر بندی نے دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر کر دی، اور اس سے اس کی زندگی کو گھن لگ گیا۔ شراب اور بد اعتدالیوں نے اس کی صحت کی بنیادیں کھوکھلی کر ہی دی تھیں، رہی سہی کسر اس روحانی تکلیف نے پوری کر دی۔ ۱۷۴۰ء (۲۸۔ اپریل) میں اچانک اس کا انتقال ہوگیا۔

مستانی پونا میں قید تھی۔ جب اسے باجی راؤ کی وفات کی خبر ملی، تو اس کی روح پرواز کر گئی۔ یہ آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ آیا اس کی موت صدمے سے ہوئی، یا اس نے خودکشی کی تھی۔ بہرحال اس شہیدِ محبت کی معمولی سی قبر پونا سے ۲۰۔۳۰ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں "پابل" نامی میں دیکھی جا سکتی ہے جو دنیا کی بے ثباتی اور عشق و محبت کی خونیں داستان کا عبرت ناک مرقع ہے۔

مستانی کے بطن سے باجی راؤ کے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا چونکہ مستانی مذہباً مسلمان تھی، پیشوا نے اس لڑکے کا نام شمشیر بہادر رکھا اور اس کی پرورش بھی اسلامی طریقے پر ہوئی۔ بعد میں اس نے بندھیل کھنڈ کی اپنی جاگیر میں سے باندہ بطور تحفہ اس لڑکے کے نام کر دیا، جس سے متعلق کہا جاتا ہے، کہ کسی زمانے میں اس کے محاصل تیس لاکھ سالانہ تھے۔

شمشیر بہادر کی صحیح تاریخِ پیدائش معلوم نہیں، لیکن چونکہ پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) کے وقت اس کی عمر ۲۷ برس کی بتائی گئی ہے، اس لئے قیاس ہے، کہ اس کی پیدائش ۱۷۳۴ء کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ یہ لڑائی مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی اور اس میں مرہٹوں کو شکستِ فاش ہوئی تھی۔ اس موقع پر شمشیر بہادر مرہٹوں کی طرف سے شریکِ جنگ تھا اور اس کے ایسے کاری زخم آئے تھے کہ وہ ان سے جانبر نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک لڑکا علی بہادر نام[2] چھوڑا۔

---

[1]۔ یہ سردیسائی کا بیان ہے۔ راؤ لکھتے ہیں، کہ جب نمائندہ واپس پونا آیا، تو اس نے باجی راؤ کے بیٹے نانا صاحب سے کہا کہ مستانی کے بغیر باجی راؤ کی زندگی محال ہے۔ بہتر یہی ہے، کہ اسے آزاد کرکے اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ وہ "پابل" تک پہنچی تھی، کہ اسے باجی راؤ کے انتقال کی خبر ملی، جس کے سنتے ہی وہ ختم ہوگئی۔

[2] یہاں ایک غلطی کی تصحیح کر دینا چاہیے

عام طور پر یہ مشہور ہے اور تقریباً سب مؤرخ وغیرہ یہی لکھتے ہیں، کہ مستانی کے بطن سے باجی راؤ کے بیٹے کا نام علی بہادر تھا۔ یہ غلط ہے۔ تمام مرہٹی ماخذ، جو اس بارے میں زیادہ قابلِ اعتماد ہیں، اس پر متفق ہیں (باقی اگلے صفحے)

شمشیر بہادر کی وفات کے بعد علی بہادر اس کا وارث اور باندہ کی جاگیر کا مالک ہُوا۔ مہادجی سیندھیا کا نام اس لئے مشہور ہے کہ اس نے شاہ عالم ثانی کو غلام قادر خاں روہیلا کے پنجے سے نجات دلائی تھی۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ غلام قادر کی گرفتاری کا سہرا علی بہادر کے سر ہے۔ جب سیندھیا کی فوج شاہ عالم کی مدد کے لئے دہلی پہنچی، تو غلام قادر نے لال قلعہ سے راہِ فرار اختیار کی۔ اس نے پہلے میرٹھ کے قلعے میں پناہ لی۔ علی بہادر نے اس کا تعاقب کیا۔ چند ہفتے کے محاصرے کے بعد غلام قادر چند سپاہیوں کے ساتھ یہاں سے بھی کھسک گیا اور شاملی سے تین میل جنوب مغرب کی طرف ایک گاؤں بمنولی میں ایک برہمن کے گھر میں جا چھپا۔ برہمن نے مخبری کی اور علی بہادر کو اطلاع دے دی اور یہ گرفتار ہو گیا۔ علی بہادر نے اسے پابجولاں لاکے مہادجی سیندھیا کے پیش کر دیا۔ آخر شاہ عالم کے حکم سے سیندھیا نے اسے اندھا کروا کے ۴ مارچ ۱۷۸۹ء کو قتل کروا دیا۔ کلوخ انداز را پاداشِ سنگ است۔

جلد ہی مہادجی سیندھیا اور علی بہادر کی آپس میں بگڑ گئی۔ آخر علی بہادر اپنے رفقا سمیت اس سے الگ ہو گیا۔ برسوں کی آوارہ گردی کے بعد اس نے باندہ کے گرد و نواح میں ایک مضبوط ریاست قائم کر لی۔ وہ کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کئے پڑا تھا، کہ ۲۰۔ اگست ۱۸۰۲ء کو معمولی علالت کے بعد اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ غلام قادر روہیلے کی گرفتاری کے سلسلے میں اس نے جو خدمات سرانجام دی تھیں ان کے صلے میں شاہ عالم نے اجازت دی تھی کہ اس کے خاندان کی میتیں قطب صاحب دہلی میں دفن ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ جب علی بہادر کالنجر میں فوت ہُوا تو اس کی لاش دہلی میں لائی گئی، اور قطب صاحب میں دفن ہوئی[1]

علی بہادر کی وفات کے وقت اس کا بڑا بیٹا شمشیر بہادر پونا میں تھا۔

(دیکھیے پچھلے صفحے سے آگے) کہ اس لڑکے کا نام شمشیر بہادر تھا اور علی بہادر اس شمشیر بہادر کا بیٹا اور مستانی کا پوتا تھا۔ چونکہ شمشیر بہادر عین جوانی میں فوت ہو گیا اور اس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آ سکا تھا، اس لئے جب لوگوں نے علی بہادر کو دیکھا اور اس کا نام سُنا تو یہی خیال کیا کہ مستانی کا بیٹا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط تھی۔

[1] خم خانۂ جاوید (۳)، ص ۲۰۳

باندہ میں اس کا چھوٹا علاتی بھائی ذوالفقار بہادر اور اس کا ماموں غنی بہادر تھے۔ غنی بہادر نے ذوالفقار بہادر کو گدی پر بٹھا دیا، فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور کالنجر کا محاصرہ جاری رکھا۔ جب شمشیر بہادر کو پونا میں باپ کی وفات کی خبر ملی تو وہ منزلیں مارتا ہُوا باندہ پہنچا۔ یہاں پہنچ کے اس نے ذوالفقار بہادر کو مسند سے اُتار دیا اور غنی بہادر کو گرفتار کر کے اجے گڑھ کے قلعے میں نظر بند کر دیا، جہاں بعد میں زہر خورانی سے اس کی موت واقع ہوئی۔

باندہ کی ریاست انگریزوں نے ۱۸۰۴ء میں واپس لے لی اور اس کی جگہ شمشیر بہادر کا چار لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ خود اس کے اور اس کے خاندان کے گذارے کے لئے مقرر کر دیا۔ پھر اس کے چند سال بعد اسے باندہ کے قریب خاصا بڑا علاقہ سکونت کے لئے دیا اور اسے اجازت دی کہ وہ باوردی محافظ دستہ (باڈی گارڈ) ملازم رکھ سکتا ہے۔

شمشیر بہادر ۳۰۔ اگست ۱۸۲۳ء[2] (مطابق ۴۔ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ[3]) کو لاولد فوت ہُوا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا سوتیلا بھائی ذوالفقار بہادر اس کا جانشین ہُوا۔ جب ذوالفقار بہادر کا بھی ۱۸۵۰ء میں انتقال ہو گیا، تو اس کا بڑا بیٹا علی بہادر (ثانی) اس کا وارث ہُوا۔

(۳)

۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ علی بہادر ثانی کے زمانے ہی میں ہوا اور وہ بھی

---

[1] "تاریخ بندھیل کھنڈ و جالون" مرتبہ کشن زاتشی (۱۸۷۳ء) ص ۱۰۹۔ "مفتاح التواریخ" مرتبہ ولیم بیل (ص ۔ ۳۸۱) میں تاریخ ۲۰۔ اگست لکھی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔

[2] "تاریخ بندھیل کھنڈ و جالون" کا جو نسخہ نذیریہ کتب خانہ (دہلی) میں ہے، اس کے حاشیے میں کسی نے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی ہے۔ "احسان علی نام ایک لڑکا ایک غیر منکوحہ سے تھا۔ اس نے دعویٰ کیا، مگر انگریزوں نے منظور نہ کیا"۔ دوسرے ذرائع سے معلوم ہے کہ شمشیر بہادر کی بیوی (سُہینی بیگم) کے علاوہ اس کی ایک حرم بھی تھی۔ اس کا نام "بی مُونگا" تھا۔ ممکن ہے، کہ یہ احسان علی اسی کا بیٹا ہو۔

[3] بعض تحریروں میں ان کا نام ذوالفقار علی لکھا ملتا ہے۔ یہ اُن کا عُرف ہو گا، ورنہ نام ذوالفقار بہادر ہی تھا۔

اس سلسلے میں معتوبِ سرکار ہوئے تھے۔ دیسی سپاہ نے جب ۵ جون ۱۸۵۷ء کو الٰہ آباد کے جیل کے دروازے کھول دئے، تو یہ جمِ غفیر دوسری سپاہ کے ساتھ کوچ کرتا ہوا ۸ جون ۱۸۵۷ء کو باندہ پہنچا۔ یہاں انھوں نے علی بہادر کی نوابی کا اعلان کر دیا۔ علی بہادر کو بھی طوعاً و کرہاً ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ باندہ کا انگریز کلکٹر مسٹر مین (F. O. Mayne) بھاگ کے الٰہ آباد چلا گیا، لیکن مجسٹریٹ کاکرل (Cockerell) صاحب دیسی سپاہ کے ہتھے چڑھ گیا اور اسے انھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

علی بہادر کو میجر جنرل وٹلاک (Whitlock) نے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو مدراس کی فوج کی مدد سے شکست دی۔ نواب نے دیکھا کہ اب مزید مقابلہ بے سود ہے تو اس نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ انگریزوں نے تمام جاید اد ضبط کر لی اور ہتھیار رکھنے کی ممانعت کر دی۔ ارادہ تھا کہ ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ قائم کیا جائے۔ لیکن چونکہ انھوں نے بذاتِ خود کسی انگریز یا یورپی کو قتل نہیں کیا تھا، نہ براہِ راست کسی جارحانہ کارروائی میں حصہ لیا تھا، بلکہ بعض انگریزوں کی جانیں محض ان کی وجہ سے بچ گئی تھیں اس لئے حکومت نے فیصلہ کیا، کہ انھیں تین ہزار ماہانہ وظیفہ دے کے مہو چھاؤنی (اندور) میں نظر بند کر دیا جائے اور وہ حکاّم کی اجازت کے بغیر یہاں سے باہر نہ جائیں۔ نواب کی والدہ نے بھوپال میں پناہ لی تھی انھیں سیہور جانے کا حکم ہوا۔ ۱۸۶۰ء میں انھوں نے درخواست دی کہ یہاں کی آب و ہوا مجھے راس نہیں اور میری صحت تباہ ہو رہی ہے اگر سرکار کو میرا بھوپال میں رہنا منظور نہیں، تو مجھے آگرہ، گوالیار، کانپور۔ ان تینوں مقامات میں سے کسی جگہ رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ وہ آگرہ میں رہیں۔

نواب نے بھی فروری ۱۸۶۲ء میں درخواست دی کہ اندور کی آب و ہوا میرے موافق نہیں، مجھے صوبۂ مغرب و شمال (یوپی) میں الٰہ آباد یا کانپور یا آگرہ میں رہنے کی اجازت ہو۔ الٰہ آباد اور کانپور کی اجازت تو اس لئے نہ ملی کہ یہ مقامات باندہ سے بہت قریب تھے اور حکومت کو ان کا اپنی سابقہ سرگرمیوں کے مرکز کے اتنا نزدیک رہنا گوارا نہیں تھا۔ اور چونکہ آگرے میں ان کی والدہ پہلے سے موجود تھیں، اس لئے ان کا بھی مستقل طور پر وہاں رہنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا گیا۔ آخر تجویز یہ ہوئی کہ انھیں ڈیڑھ دن بھیج دیا جائے

لیکن آخری فیصلہ کرنے سے پہلے حکومت نے مقامی ڈاکٹر کو حکم دیا، کہ نواب کا طبّی معائنہ کرکے رپورٹ کی جائے تاکہ معلوم ہو، کہ کیا واقعی مہو کی آب و ہوا کا ان کی صحت پر برا اثر پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس میں شبہ نہیں کہ عام بے اعتدالیوں اور افیون کے کثرتِ استعمال سے ان کی صحت بہت کمزور ہو گئی ہے، لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی صحت کی بنا پر نقلِ مکان لازمی ہے۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ اگر وہ چاہیں، تو جاڑے کے زمانے میں تین مہینے کے لیے اپنی والدہ کے پاس آگرے چلے جائیں، مستقل سکونت مہو ہی میں رہے گی۔

نواب علی بہادر کا انتقال ۱۴۔ اگست ۱۸۷۳ء کو بنارس میں ہوا، جہاں وہ حکومت کی اجازت سے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

نواب نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ ان کی پہلی بیوی کا نام مبارک محل تھا جن سے باندہ میں نکاح ہوا۔ بعد میں انھوں نے ان کی چھوٹی بہن افتخار محل سے بھی نکاح کرنا چاہا۔ لیکن چونکہ شریعتِ اسلام میں دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کی ممانعت ہے اس لیے وہ کھلے بندوں تو ایسا نہ کر سکے البتہ افتخار محل ان کی بیوی تسلیم کی جاتی تھی۔ آخرکار انھوں نے مبارک محل کو ۱۸۶۴ء میں طلاق دے دی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انھیں ساڑھے تین سو ماہانہ وظیفہ دیتے رہے، حالانکہ افتخار محل کو صرف ۲۷۰ روپے دیتے تھے۔ مبارک محل سے ان کے دو بیٹے ہوئے۔ ذوالفقار بہادر عرف نواب بہادر سب سے بڑا بیٹا اور سردار بہادر تیسرا سب سے چھوٹا بیٹا۔ منجھلا بیٹا شمشیر بہادر عرف امراؤ بہادر اور دو لڑکیاں صغرا بیگم اور وزیر بیگم افتخار محل کے بطن سے تھیں۔ تیسری بیوی کا نام ممتاز محل تھا۔ یہ دراصل رقاصہ تھیں۔ ان سے اندور میں نکاح کیا تھا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حکومت نے فیصلہ کیا، کہ نواب کا ایک تہائی وظیفہ ان کے وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ اس کے مطابق یوں تقسیم ہوئی۔ مبارک محل، ۲۰۰ روپیہ افتخار محل، ۱۰۰ روپیہ۔ ممتاز محل، ۱۰۰ روپیہ۔ نواب بہادر (عمر ۱۹ برس)، ۴۰۰ روپیہ۔ دوسرے دونوں بیٹوں کو سو سو روپیہ۔ امراؤ بہادر اٹھارہ برس کا تھا اور سردار بہادر گیارہ برس کا۔

نواب نے اپنی زندگی میں صغرا بیگم اور وزیر بیگم کی شادی کے لیے حکومت سے امداد کی درخواست کی تھی اور کہا کہ میری حیثیت اور خاندان کی پرانی

روایات کے بہ نظر ان تقریبوں پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ یہاں سے جواب ملا کہ دونوں شادیوں کے لئے پانچ پانچ ہزار دیا جائے گا۔ ابھی ان کے نکاح ہونے ہی نہیں پائے تھے کہ نواب چل بسے۔ ان کی شادی بعد میں ہوئی۔ یہ دونوں شاہی خاندان کے مشہور شہزادے میرزا الٰہی بخش کے دو بیٹوں سے منسوب تھیں۔ جب نواب کے مرنے کے بعد ان کے وارثوں کو ایک ہزار روپیہ بہ شرح حصہ دیا گیا، تو ان دونوں بہنوں نے بھی اپنے حصّے کا مطالبہ کیا۔ لیکن ان کی درخواست دو سبب سے رد کر دی گئی۔ اول یہ کہ ان کی شادی کے لئے دس ہزار کی گراں قدر رقم دی جا چکی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ ایک دوسرے خاندان میں منتقل ہو چکی ہیں۔ اس لیے جائز طور پر اب انھیں امداد نہیں دی جا سکتی۔"

(۳)

نواب علی بہادر شعر بھی کہتے تھے۔ علی تخلص تھا اور میرزا عباس بیگ عباس بریلوی کے شاگرد تھے۔ عباس جب بعد میں لکھنؤ آکے آتش کے شاگرد ہوئے، تو استاد نے ان کا تخلص بدل کے نادر کر دیا تھا۔ یہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں باندہ ہی میں تھے۔ بعد میں گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی[1]

نواب علی بہادر نے عباس کے علاوہ منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے بھی اصلاح لی تھی۔ تین شعر ملے[2]:

خیالِ زلف میں ہے رنج بے حساب ہمیں رُخ   بلا میں ہے دلِ آشفتہ پیچ و تاب ہمیں رُخ

ہمیں سمجھتے ہیں اس رنگِ سُرخ کی تہ کو   عتاب چہرے سے ظاہر ہے، پیار ہے دل میں

بغیر ابر کے برسے اڑ جائے گی گرمی   رلاؤ شوق سے مجھ کو، بخار ہے دل میں

علی بہادر کے منجھلے صاحبزادے شمشیر بہادر بھی شاعر تھے۔ دلیر تخلص تھا۔ منیر شکوہ آبادی اور جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان شائع شدہ موجود ہے[3]

(۴)

غالب ایک خط میں، انور الدولہ نواب محمد سعد الدین خاں شفق رئیس کالپی کو لکھتے ہیں[4]:-

"میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزومند ہوں۔ میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشینِ حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہم شیر بھی تھا، یعنی میں نے اپنی ممانی کا اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا، وہ باعث ہوا تھا میرے بوندھیل کھنڈ آنے کا .... وہ ارادہ قوّت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ خان (؟ اوزبک جان) میرا بھائی مر گیا : اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

اس عبارت میں مسند نشینِ حال سے یہی نواب علی بہادر ثانی مراد ہیں۔ اس سے مزید یہ معلوم ہوا کہ نواب علی بہادر اول کی ایک بیوی اور غالب کی ممانی سگی بہنیں تھیں۔

غالب کے مندرجۂ ذیل مدحیہ شعر میں بھی انھیں علی بہادر ثانی کی طرف تلمیح ہے ؎

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

---

[1] یادگارِ ضیغم، ص ۵۲

[2] سخن شعرا، ص ۳۳۶

[3] خم خانۂ جاوید (۳)، ص ۲۰۱-۲۰۵

[4] خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد)، جلد اوّل ص ۱۳۶

جگن ناتھ آزاد

اے وادئ کشمیر

جلوہ ترا محبوبِ شہنشاہِ جہانگیر
اقبال کی تخئیل ترے دام کی نخچیر
اے وادئ کشمیر

فرقت زدہ عاشق ملے معشوقہ سے جیسے
یوں ابرِ سیاہ مست ہے ندی سے بغلگیر
اے وادئ کشمیر

اڑتا ہوا بادل ہے کہ ہے بولتا جادو
بہتا ہوا نالہ ہے کہ ہے پاؤں کی زنجیر
اے وادئ کشمیر

جھرنوں کی ہے آواز کہ ہے اذنِ خموشی
سبزے کی خموشی ہے کہ ہے عالمِ تقریر
اے وادئ کشمیر

ہر قطرۂ باراں ہے ترا کیف کا سیلاب
ہر ذرۂ خاکی ہے ترا حسن کی تصویر
اے وادئ کشمیر

تہذیب کے چہرے پہ بھی تاباں ہے ترا نور
فطرت کے مناظر ہی نہیں ہیں تری تصویر
اے وادئ کشمیر

شاداب چٹانوں میں یہ بہتے ہوئے دریا
پیچ پیچ کے یہ دریا ہیں کہ ہے عالمِ تصویر
اے وادئ کشمیر

تو ہند کے ماتھے پہ ہے اک تاجِ درخشاں
اور تاج بھی وہ تاج کہ ہے حاملِ توقیر
اے وادئ کشمیر

ہنسر دہے ترے معدنِ معنی کا جواہر
چکبست ترے جلوۂ صدرنگ کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

جو ڈل پہ چمکتا ہے پہاڑوں سے ابھر کر
بن جا اسی خورشیدِ جہانتاب کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

سپرو کی زباں تیرے تمدن کا نمونہ
ملّا کا سخن تیری ہواؤں کی ہے تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

مہکے ترے باغوں کا شباب اور زیادہ
کچھ اور فزوں تیری بہاروں کی ہو تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

حسرت ہو کہ مہجور، غنی ہو کہ ہو اقبال
تیرے قلمِ کیف کی اک شوخیٔ تحریر
اے وادیٔ کشمیر

آباد ہو کچھ اور ترا درد دلوں میں
کچھ اور دماغوں میں ہو پختہ تری توقیر
اے وادیٔ کشمیر

اٹھیں گے ابھی اور تری خاک سے فنکار
کرنا ہے ابھی اور دلوں کو تجھے تسخیر
اے وادیٔ کشمیر

تاثیر وہ اک تیری ہواؤں کو ملی ہے
جو خاک کو تریاق کرے زہر کو اکسیر
اے وادیٔ کشمیر

اللہ کرے جلد وہ دن آئے کہ جس دن
چمکے تری دنیا پہ مرے فکر کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

محوی صدیقی لکھنوی

تذکرۂ فرح بخش

بھوپال کا علمی پس منظر

بھوپال وسط ہند کی ایک مشہور ریاست ہے جس کی بنیاد ۱۱۲۰ھ میں امیر دوست محمد خاں نے ڈالی۔ یہ ریاست ہندوستان میں کئی وجوہ سے شہرت اور اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ انھیں وجوہ میں ایک بڑا اور نمایاں سبب اس کے فرماں رواؤں کی علم پروری اور ادب نوازی، علماء کی قدردانی، ادیبوں اور شاعروں کی بقدر منا[سب] حوصلہ افزائی اور ہمت آفرینی ہے یہی وہ چیزیں ہیں جو جگہ جگہ سے کمال و ہنر کے پرستاروں کو اور گوشے گوشے سے علم و دانش کے خدمت گزاروں کو کھینچ کر لاتی ہیں۔ انھیں معاشی فراغ بالی اور سکونِ خاطر بہم پہنچاتی ہیں۔ ان کے جوہر کھلتے اور کمالات کے چشمے اُبلتے ہیں۔ انھیں کی بدولت شہر و دیار علم و ہنر کا مرکز بن کر سنورتے ہیں اور ان کے فرماں رواؤں کو حیاتِ جاوید عطا کرتے ہیں۔

اس فطری اصول کی بنا پر بھوپال نے اپنے دورِ ماضی میں نمایاں سربلندی حاصل کی اخاص کر تقریباً ایک صدی پہلے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب و عجم، یورپ اور ایشیا غرض کہ دنیا بھر میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔

اگرچہ تمام دیسی ریاستوں کی طرح اس کا ابتدائی دور بھی بہت پُرآشوب صبر آزما تیغ زنی اور طاقت آزمائی کا دَور تھا۔ لیکن ادھر سے جتنی فرصت ملتی گئی یہاں کے حکمراں اپنی ریاست کی تمدنی ترقی اور علم و ہنر کی حوصلہ افزائی پر توجہ فرماتے گئے اور روز بروز یہ ذوق بڑھتا رہا۔ بالآخر نواب شاہ جہاں بیگم کا آخری دورِ حکومت پوری ریاست کی تاریخ کا سب سے زیادہ ممتاز سب سے زیادہ تابناک بن گیا۔

اس شہرت کا خاص سبب

اس کا تمام تر سہرا بیگم کے دوسرے شوہر نواب سیّد صدیق حسن خاں مرحوم کے سر ہے جو علمی دنیا میں خود بھی بلند درجہ رکھتے تھے۔

۱۲۸۸ھ مطابق مئی ۱۸۷۱ء میں بیگم سے ان کا عقد ہوا۔ اسی تاریخ سے بھوپال کی علمی قدردانی اور شہرت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ نواب صاحب مرحوم کے ایما سے اہلِ علم و ادب کی قدردانی کے لئے بیگم صاحبہ نے خزانے کے دروازے کھول دیئے بیگم اور نواب دونوں نے مل کر اس چھوٹی سی ریاست کا آوازہ تمام حدودِ عالم تک پہنچا دیا۔ علم و ادب کے جتنے شعبے بھی ہو سکتے تھے سب کھل گئے۔ علماء اور شعراء بکثرت جمع ہو گئے اس وقت علمی ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی زبان کا غلبہ تھا مگر اردو بھی اُبھر رہی تھی اور فارسی کو دباتی جاتی تھی۔ غرض کہ ہر علم و فن کی کتابیں اردو، فارسی عربی تینوں زبانوں میں بکثرت تصنیف و تالیف اور طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آنے لگیں۔

بھوپال اور شعرا کے تذکرے

ایسے زمانے میں یہ خیال ہونا ناگزیر تھا کہ شعراء کے تذکرے بھی لکھے اور شائع کئے جائیں۔ پھر علم و ادب کا یہ گوشہ بھی سامنے آنا ضروری تھا کہ فارسی زبان کے شعراء کے تذکرے لکھنا ہی کافی اور قرینِ انصاف نہیں بلکہ اردو زبان کے شاعر بھی بجا طور پر اس کے حق دار ہیں کہ ان کی حیاتِ جاوید کا سامان کیا جائے۔ اس خیال کو اُن بہت سے تذکروں نے مزید تقویت دی جو شمالی ہند میں تقریباً چوتھائی صدی پہلے تصنیف اور شائع ہو چکے تھے۔ غرض کہ یہ کام یہاں بھی شروع ہو گیا۔ مگر ترجیح فارسی زبان ہی کو

رہی۔ حالانکہ زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اب اس ملک میں اس زبان کا مستقبل کیا ہے، بہرحال اب تک یہاں کے تصنیف شدہ تذکرے جتنے بھی مجھے ملے ہیں ان کی تعداد بائیس ہے اور ان میں دو کے سوا سب فارسی زبان میں ہیں۔

اُردو کا پہلا تذکرہ

عجیب اتفاق ہے کہ سب سے پہلا تذکرہ اُردو زبان میں لکھا گیا۔ اس کا سن طباعت ۱۲۸۸ھ "تذکرۂ فرح بخش" نام ہے۔ اسے تذکرہ تو کیا بیاض کہنا چاہئیے یہ تذکرہ صرف ایک رات میں تصنیف ہوا ہے۔ حجم کے لحاظ سے سب سے چھوٹا اور عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے۔ گویا بھوپال کے تذکروں کا باوا آدم ہے اور اَلفَضلُ لِلمُتَقَدِّم کے مصداق اس کو وہ برتری حاصل ہے جو بزرگوں کو اپنے چھوٹوں پر ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ عمر میں زیادہ تفاوت نہ ہو۔

اس کے مصنف نواب یار محمد خاں شوکت ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہاں تذکرہ لکھنے کا خیال سب سے پہلے انھیں کو ہوا۔ اسی تذکرے نے نواب سید صدیق حسن (خاں) پھر اُن کے بعض معاصرین کو تذکرے لکھنے کا شوق یا احساس دلایا۔

یہ تذکرہ مطبع نظامی کان پور میں چھپا ہے جو کسی زمانے میں ہندوستان کا مشہور اور نامور مطبع تھا۔ لکھائی چھپائی کی عمدگی اور صحت کے لحاظ سے اس نے بڑا نام اور بلند مقام پیدا کر لیا تھا۔

تذکرۂ فرح بخش کا سائز ۲۰×۲۶/۸ ہے جو اس دور کا مقبول عام اور پسندیدہ سائز تھا اور تمام تذکرے بھی اسی سائز پر ہیں۔ پہلے صفحے پر جسے سرورق یا لوح کہتے تھے، بیچوں بیچ میں گول دائرے کے اندر نام (تذکرۂ فرح بخش) نام کے نیچے ۱۲۸۸ھ لکھا ہے۔ نام کے آس پاس دائرہ میں یہ عبارت ہے "انتا لیفات جلیل شاعر شیریں مقال، قمری سرو جوئبار نازک خیالی / صدر نشین شعرا بلند فطرت، جناب یار محمد خاں بہادر متخلص بہ شوکت / گلدستہ از مضامین سراپا نقش یعنی (تذکرۂ فرح بخش"

حجم ۸۰ صفحات ہے اور ہر صفحے میں نہایت جلی قلم سے صرف سات سطریں ہیں۔ خط پاکیزہ اور چھپائی عمدہ ہے۔ عبارت قافیہ دار ہے اور یوں آغاز ہوتا ہے:۔ "فرح بخش دل ہائے ارباب ایمان حمد الٰہی ہے۔ نشاط افزائے قلوب اصحاب ایقان نعت رسالت پناہی ہے۔"

یہ ہے اس وقت کی ادیبانہ اور منشیانہ اُردو، جس میں ایک لفظ (ہے) کے سوا اور کوئی لفظ اُردو کا نہیں آیا۔ کتاب کی تصنیف کا سبب بھی مصنف ہی کی زبان قلم سے سُن لیجئے:۔

"بعد ازیں بندۂ درگاہ رب العزت یار محمد خاں شوکت گذارش کرتا ہے۔ مدعائے دل نگارش کرتا ہے۔ مجھ کو عنفوان شباب سے شعر و سخن کا شوق ہے۔ اقسام و انواع کلام موزوں سے دل کو نہایت ذوق ہے!"

اس انداز کلام سے شاید آپ کی طبیعت اُکتا جائے اس لئے بقیہ مضمون اپنے رنگ میں پیش کرتا ہوں۔

۱۲۸۸ھ میں شب برات کے مہینے کی پندرہ تاریخ کو میں سیر کے لئے اپنے باغ فرح بخش کو گیا۔ دل کش سبزہ زاروں، فرحت افزا آبشاروں کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ میر تقی میر کا یہ شعر یاد آیا۔

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جوان، کچھ تو کیا چاہیئے

اس کو بار بار پڑھتا ہوا سر شام گھر پہنچا۔ بے اختیار عاشقانہ اشعار دیکھنے کو جی چاہا۔ اسی عالم سرور میں میں نے قلم دان منگوایا اور اپنی بیاض سے چند موجود نازک خیال شاعروں کے اشعار چن لئے۔ ایک ہی رات میں یہ تذکرہ تیار ہو گیا جس پر گلشن کشمیر کو رشک ہو تو بجا ہے۔ فرح بخش نام ہے: "نشاط افزا گنجینۂ مسرت" ۱۲۸۹ اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کے چار باب ہیں اور ہر باب کا نام گلشن ہے۔

۱۔ پہلے گلشن میں ان شاعروں کا حال ہے۔ جو بیت الکمال (کمال کا گھر) بلدۂ بھوپال میں ہیں۔

۲۔ دوسرے گلشن میں وہ شاعر مذکور ہیں۔ جو یہاں تھے مگر اب منتشر ہیں۔

۳۔ تیسرے گلشن میں ان شعراء کا بیان ہے جو یہاں حکومت کے ملازم تھے مگر اب یہاں نہیں اور کہیں چلے گئے۔

۴۔ چوتھے گلشن میں ان نامور ادیبوں کا حال ہے۔ جن کے وجود سے ہندوستان کا چمن نادر ایک باغ بے خار ہے۔

ان ۸۰ صفحوں میں کل پچیس شعراء کے نام مختصر حالات اور چنا ہوا تھوڑا سا کلام ہے۔ سب سے پہلے فرماں روائے بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کا ذکر ہے۔ پھر اُن کے وزیر اعظم مدار المہام مولوی جمال الدین خاں کا کلام ہے۔ جن کا تخلص کمال ہے۔ ان کے بعد نواب سید صدیق حسن (خاں) کا بیان ہے۔ باقی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سید عزیز حسن عزیز
۲۔ جگل کشور (تخلص نہیں لکھا)

۳۔ محمد عسکری (تخلص نہیں لکھا)

۴۔ محمد عباس۔ رفعت

۵۔ شوکت۔ مُصنّف

۶۔ نواب جہانگیر محمد خاں۔ دولہ

۷۔ غلام ضامن۔ کرم

۸۔ حبیب احمد۔ دولت

۹۔ عبدالواحد۔ مسکین

۱۰۔ امداد علی۔ امداد

۱۱۔ سید حسین شاہ۔ واصف

۱۲۔ یمین الدین احمد معروف بہ مولوی بخاری۔

۱۳۔ عبدالعلی۔ تونگر

۱۴۔ کنج بہاری لال۔ خلّت

۱۵۔ نجف علی (تخلص نہیں لکھا)

۱۶۔ سید واصل علی۔ (تخلص نہیں لکھا)

۱۷۔ منشی عبدالعزیز۔ اعجاز سہسوانی

چوتھے گلشن میں

۱۸۔ مرزا غالب

۱۹۔ واکر صاحب (انگریز)

۲۰۔ مولوی سید شریف حسن

۲۱۔ مولوی احمد حسن۔ عرشی (نواب سید صدیق حسن (خاں) کے بڑے بھائی)

۲۲۔ مرزا دبیر۔ لکھنوی۔

اس تذکرے میں ہندوستان کے صرف دو مشہور اور نامور شاعر مذکور ہیں۔ مرزا غالب اور مرزا دبیر۔ ایک صاحب بہادر ہیں۔ ان کے حالات دو دو چار چار سطروں میں ہیں۔ حالات کیا ہیں۔ زیادہ تر شاعرانہ قافیہ پیمائی عبارت آرائی۔ مدح سرائی اور حد سے زیادہ مبالغہ فرمائی ہے۔

۲۷ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ کو اس تذکرے کی طباعت ختم ہوئی۔ آخر میں مولوی حافظ عبدالرحمٰن خاں شاکر، مالک مطبع نظامی، اعجاز سہسوانی اور گرباپرشاد فضا[1] نجبانی کے تاریخی قطعات درج ہیں۔

شوکت کی ایک کتاب شہنشاہ نامہ ہے۔ یہ شاہ نامہ فردوسی کے وزن پر ایک مثنوی ہے۔ جس میں سرکار مدینہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات (لڑائیوں) کے تاریخی حالات نظم کئے ہیں۔ ۱۲۹۲ھ میں تالیف اور مطبع حسینی یا دبدبۂ سکندری ریاست رام پور میں چھپی ہے۔ اس کے آخر میں مصنف کے حالات لکھے ہیں۔ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا۔ عنوان یہ ہے:۔

"خاتمہ مشتمل بر احوال شوکت صاحب کمال"

یہ بہت مختصر مگر صحیح حالات ہیں۔ خلاصہ یہ کہ، یار محمد خاں شوکت۔ ریاست بھوپال کے بانی دولت محمد خاں کی پانچویں پشت میں ہیں۔ بمبئی زون مطلع علوم ہیں ۲۷ صفر ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور کمال ناز و نعمت سے پرورش پائی نواب فوجدار محمد خاں کے بیٹے تھے۔ فوجدار محمد خاں، نواب گوہر قدسیہ بیگم کے سگے بھائی اور سکندر بیگم کے ماموں تھے۔ نواب شوکت اس رشتہ سے نواب شاہ جہان بیگم کے ماموں اور سلطان جہاں بیگم کے نانا ہوتے ہیں۔ انھوں نے بہت اختصار کے ساتھ اپنے تعلیمی حالات لکھے ہیں۔ کہ سن تمیز کے آغاز سے علوم و فنون کی جانب طبیعت راغب ہے۔ میں نے نہایت شوق سے اپنے زمانے کے ارباب کمال کی خدمت میں سیف و قلم کے کمالات حاصل کئے۔ استادوں کے نام یہ ہیں۔

نواب شوکت کے اساتذہ

۱۔ مولوی سید عبداللہ متوطن خوشاب (پنجاب) یہ اس دور کے زبردست اور مشہور عالم اور بڑے با فیض بزرگ تھے۔ بھوپال کے بہت سے اہل علم و کمال اور ارباب شعر و ادب ان کے شاگرد تھے۔

شوکت اپنی کتاب گلدستۂ نرگس میں (صفحہ ۱۳۱) پر ان کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"جناب استاذی، ملاذی، ثانی تفتازانی، ہمسر علامۂ دوانی مولوی سید عبداللہ صاحب سلمہ اللہ قوی الواھب۔"

---

[1] فضا لکھنوی بہت اچھے خوشنویس اور بہترین شاعر تھے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ نول کشور پریس لکھنؤ اور نظامی مطبع کانپور کا اکثر کام کرتے تھے۔ غالباً اس تذکرے کی کتابت انھیں نے کی ہے فضا کی ایک نایاب مطبوعہ مثنوی راقم کے کتب خانہ میں ہے جس کا نام گلزار فضا ہے۔ فضا کے قطعات تاریخ طباعت ان دونوں پریسوں کی اکثر مطبوعہ کتابوں کے آخر میں ملتے ہیں

۲۔ منشی احمد علی احمد۔ یہ بوہرہ قوم کے ایک فاضل تھے۔ شاعر و باکمال خوشنویس تھے۔ ان سے فنونِ ادب اور آدابِ مجلس اور علمِ طب کی تعلیم پائی۔ ان دونوں استادوں سے عربی فارسی کی درسی کتابیں پڑھ کر استعداد اور قابلیت پیدا کی۔

انشاءِ نورِ چشم میں لکھتے ہیں:۔

"منشی احمد علی خلف ملا اسماعیل صاحب خطِ نسخ و شکستہ و نستعلیق کے ماہر اور منشی زبردست شاعر ہیں۔ والد کے میر منشی تھے اور میرے استاد ہیں اپنے وقت کے میر عماد ہیں" (صفحہ ۴۳)

۳۔ میر اکبر علی خان غازی خلف میر عابد علی خاں نبیرۂ (نواسہ) میر حیدر علی خاں غازی دہلوی سے آدابِ مجلس، فنِ طبابت اور آئینِ سیف بازی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ۱۲۷۷ھ میں بمقام سیہور وفات پائی۔ نواب شوکت اپنی تصنیف انشاءِ نورِ چشم میں صفحہ ۱۹ پر لکھتے ہیں:۔

"میرے شفیق استاد کا انتقال ہوا۔ مجھ کو نہایت رنج و ملال ہوا۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔ ان کو داخلِ جنت کرے۔ والد اس واقعہ سے بھی اداس ہے۔ یہ تاریخ ان کی رحلت کی طبع زادِ مولانا عباس ہے (قطعہ)

سیدِ عالی نسب اکبر علی — از طفیلِ مصطفےٰ مغفور باد

رفت از دنیا بسوئے آخرت — زیرِ طوبیٰ ہم نشینِ حور باد

گفت عباسِ حزیں تاریخِ او — با امام المتقین محشور باد"

۷۷ ، ہجری ۱۲

۴۔ سکندر محمد خان۔ رسالدار۔ جو سرکار شاہجہان بیگم کے باڈی گارڈ یا اردلی خاص کے رسالدار تھے۔ ان سے گھوڑے اور ہاتھی پر سوار ہونے کے آداب سیکھے۔

۵۔ مولانا محمد عباس رفعت شروانی۔ اس دور کے نامور فاضل، فارسی کے زبردست عالم اور بہت سی اردو فارسی کتابوں کے مصنف تھے۔ تاریخ نویسی سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے۔

نواب شوکت انشاءِ نورِ چشم (صفحہ ۷۰) میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا و بالفضل اولانا خلف الشیخ الشہیر الیمانی، احمد بن محمد الشروانی نخبۃ الاکیاس، استادی محمد عباس المتخلص بہ رفعت سلمہ اللہ رب العزت"

اس کے بعد مولانا عباس کی ۱۲۔ تصانیف کے نام لکھ کر تحریر کرتے ہیں:۔

"رسائل مذکور گواہ کمالاتِ ادیب مسطور ہیں۔"

۱۔ شوکت۔ نواب یار محمد خاں۔ مالک رام صاحب نے جو سلسلۂ مضامین "تلامذۂ غالب" کے عنوان سے سہ ماہی اردو ادب (علی گڑھ) میں لکھا تھا۔ شوکت کا ترجمہ اس میں موجود ہے (اردو ادب، جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۲۳)۔

۲۔ شوکت کے والد نواب فوجدار محمد خاں ہی وہ شخص ہیں جن کے کتب خانہ سے وہ قلمی نسخۂ دیوانِ غالب (اردو) دستیاب ہوا تھا۔ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے چھپ گیا ہے۔ اس وقت تک یہ غالب کے اردو دیوان کا قدیم ترین نسخہ ہمارے پاس ہے

۳۔ شوکت نے لکھا ہے کہ جب میرے اُستاد میر اکبر علی خاں کا انتقال ہوا تو مولانا محمد عباس رفعت نے قطعہ تاریخِ وفات لکھا۔ لطیفہ یہ ہے کہ جب اسی سال (۱۲۷۷ھ) نواب والاجاہ سید محمد صدیق حسن خان بہادر کے بڑے بھائی سید احمد حسن قرشی کا انتقال ہوا، تو رفعت نے خفیف سے تصرف کے بعد یہی تاریخ ان کے نام کر دی قرشی بھی غالب کے شاگرد تھے۔ تاریخ ہے ؎

قطعہ

قرشی والا گہر، احمد حسن — از طفیلِ مصطفےٰ مغفور باد

رخت بربست از جہاں سوئے بہشت — زیرِ طوبیٰ ہم نشینِ حور باد

گفت رفعت از پئے تاریخِ او — "با امام المتقین محشور باد"

۴۔ شوکت نے اپنی تصنیف "۱۲۷۷ انشائے نورِ چشم" میں غالب کی تصنیفات کے جو نام لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کہیں سے سُن کر یہ فہرست لکھ دی ہے اور خود کتابیں نہیں دیکھیں۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱) غالب نے "ماہِ نیم ماہ" نہ لکھی نہ یہ شائع ہوئی۔ ان کی تجویز یہ تھی۔ کہ "مہرِ نیم روز" کا دوسرا حصہ اس نام سے لکھیں گے۔ لیکن کتاب لکھی نہیں گئی۔

(ب) "گوہر افشاں" اور "دعانِ خیریں" غالب کی کسی تصنیف کا نام نہیں یہ محض شوکت کی دماغی اختراع ہے۔

(ج) "لیسا چین" غالباً "سبد چین" کی تصحیف ہے۔ "سبد چین" چھپ چکی ہے۔ اس میں غالب کا فارسی کلام ہے۔

(ادارہ)

ان کے علاوہ شوکت نے اپنے زمانے کے کئی نامور اور کامل فن طبیبوں، شاعروں اور فنِ سپاہ گری کے ماہروں سے علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔ اپنے مذکورۂ بالا اساتذہ کا ذکر کرنے کے بعد "فرح بخش" میں لکھتے ہیں:

"ان چند اہلِ کمال کی بدولت مجھ کو فنون و علم سے شناسائی حاصل ہوئی۔ بہ عنایت الٰہی اس ذرۂ بے مقدار کو ہر طرح حاصل دولتِ توانائی ہوئی۔"

غالب اور نواب شوکت

معلوم ہوتا ہے کہ شوکت کو مرزا غالب سے ملنے اور فنِ شعر میں ان سے استفادہ کرنے، اصلاح لینے اور شاگرد ہونے کیلیے حد شوق تھا۔ موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں لاٹ صاحب بہادر کی ملاقات کے لئے نواب سکندر بیگم آگرہ تشریف لے گئیں، شوکت بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔ بیگم صاحبہ سیر و سیاحت کے طور پر آگرہ سے دہلی گئیں۔ شوکت کے لئے اپنے مجوزہ استاد سخن سے ملنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ یہ غالب کی خدمت میں پہنچے، ان سے ملاقات کی اور شاگرد ہوئے۔ اسی خسروِ شعرائے ہند سے شوکت تخلص پایا۔ مرزا صاحب نے شوکت سے کہا کہ "آپ میرے شاگرد ہوئے۔ اگر قدرے یہاں رہنے کا اتفاق ہوتا تو فنِ شاعری میں آپ کو مہارتِ کلی حاصل ہو جاتی۔ مگر قیام ممکن نہیں۔ بھوپال میں مولانا محمد عباس، رفعت، شروانی اکبر آبادی مردِ فاضل ادیبِ کامل موجود ہیں۔ فارسی زبان ان کی نہایت فصیح اہلِ زبان سے ملتی ہے۔ بارہا اپنا کلام میرے پاس بھیج کر مولانا رفعت نے مجھ سے اصلاح لی ہے۔ اُن سے بہتر دوسرا شخص مجھے وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ میں اجازت دیتا ہوں کہ آپ ان سے اپنے کلام میں اصلاح لے کر میرے پاس بھیج دیا کریں۔"

اس ارشادِ غالب پر نواب شوکت نے عمل کیا۔ رسالہ گلدستۂ نرگس اور چند غزلیں غالب کے پاس اصلاح کو بھیجیں اور اصلاح لی۔ غالب کی وفات کے بعد جو نظم و نثر لکھیں اکثر مولانا رفعت کو دکھا کر مشتہر کیں۔ (صفحہ ۱۰۴ تا صفحہ ۱۰۷، شہنشاہ نامہ مصنفہ شوکت)

نواب شوکت اپنے تذکرۂ "فرح بخش" میں مرزا غالب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"فردوسیٔ رزم، خسروِ بزم، کلیم کلام، نظامی نظام جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب متخلص بہ غالب دہلوی علیہ الرحمۃ۔ مشاہیر علماء کے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے۔ اور دیوان اُردو اور کلیات فارسی جناب ممدوح مشہورِ آفاق ہیں۔ اس لئے صرف ایک شعر تبرکاً لکھتا ہوں:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آخر ۱۲۸۵ ہجری شہر شاہجہاں آباد میں جناب ممدوح کا انتقال ہوا۔ تاریخِ انتقال اکثر شعراء نازک خیال نے لکھی ہیں۔ از آں جملہ یہ تاریخ جناب مولانا محمد عباس رفعت کی مجھ کو یاد ہے قابلِ تحسین اور داد ہے:

جانِ اربابِ سخن غالب عالی ہمت
ناظمِ سحر بیاں، ناشرِ والا فطرت

رشکِ فردوسی و خاقانی و عالی کمال
ثانیِ خسرو و سعدی و حزیں و شوکت

ابر علامۂ کمالات و فراطِ دانش
ماہرِ علم و معانی و بیان و حکمت

از جہاں کرد سفر سوئے ریاضِ رضواں
گفت عباس کہ، شایان سریر جنت

یہ قطعہ آپ کو "فرح بخش" کے سوا کسی تذکرے میں نہ ملے گا۔

اسی تذکرے میں اپنے حالات کے سلسلے اور اپنے استادوں کے ذیل میں مرزا غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"خسروِ ملکِ سخن، ماہرِ زبانِ دری دہلوی، نجم الدولہ، دبیر الملک مرزا نوشہ نواب اسد اللہ خاں غالب دہلوی"

(صفحہ ۳۰)

شوکت کی ایک تصنیف انشاء نورِ چشم ہے۔ اس میں وہ استادِ فن مرزا غالب اور ان کی تصانیف کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ دہلوی۔ المتخلص بہ غالب مصنف (۱) مہر نیم روز (۲) ماہ نیم ماہ (۳) پنج آہنگ (۴) دستنبو (۵) دیوان فارسی (۶) دیوان اردو (۷) قاطع برہان (۸) تیغ تیز (۹) عودِ ہندی (۱۰) درفش کاویاں (۱۱) گوہر افشاں (۱۲) نادر نامہ (۱۳) پیاچین (۱۴) ردوان شکن (۱۵) اردوئے معلیٰ، ثانی ظہیر و ظہوری تھے۔ دوم ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ جناب ممدوح

کے صدہا شاگرد رشید ہیں، سب سے کمتر یہ راقم آثم ہے۔

جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوانِ فارسی میں مرقوم ہے وزیر الدولہ، امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر مرحوم رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا، نواب موصوف نے دو سال صلۂ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیر کی۔ مرزا صاحب نے ایک خط منظوم لکھ بھیجا۔ نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کئے۔ چند سال وفات سے پہلے مرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا۔ مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے مرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں۔ جناب مرحوم نے ان کو خط فارسی تحریر فرمایا۔ چونکہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیات دیوان و انشاء جناب موصوف میری نظر سے نہیں گزرے اور وہ میرے پاس موجود تھے۔ بمراد اشاعت کلام استاد و استفادۂ اوبا و نقاد احقر العباد نے تبرکاً اپنی اس انشاء میں رقم کئے" (صفحہ ۴۶ - ۴۷ - ۴۸ انشاء نرجیم۔ مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ)

کلامِ شوکت

نواب شوکت نے اپنے تذکرے فرح بخش میں اپنی دو تین غزلیں دی ہیں۔ ان غزلوں کے ایک ایک دو دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔ لیکن اگر آپ شوکت کے کلام میں غالب کا رنگ تلاش کریں تو یقیناً مایوسی ہوگی بہر حال سنئے:-

مست ہر شخص اپنے رنگ میں ہے　　شیخ تسبیح، رند بنگ میں ہے

خال ہے اس کے روئے تاباں پر　　حبشی جلوہ گر فرنگ میں ہے

خوب کہتے ہو شعر اے شوکت　　طرزِ تازہ تمہارے ڈھنگ میں ہے

دوسری غزل کے دو شعر:-

جو ردِ آہ مرے دل سے گر نکل جاوے

پہاڑ زمیں کا جگر آسماں دہل جاوے

اسیر زلفِ صنم کا ہوں ایک مدت سے

ہمارے دل سے بھلا کس طرح سے بل جاوے

مطلع کے پہلے مصرع میں لفظ 'جو' زائد اور بھرتی ہے۔ ذرا سے تصرف سے یہ عیب اس طرح نکل جاتا ہے اور مصرع کی بندش چست ہو جاتی ہے ع

"جو ردِ آہ دلِ زار سے نکل جائے"

دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں ضمیر متکلم کا اختلاف ہے، پہلے مصرع میں (ہوں) ضمیر واحد متکلم اور دوسرے میں ضمیر جمع متکلم۔ (ہمارے) لائے ہیں یہ بھی داخلِ عیب ہے۔

ذرا سی توجہ سے یہ نقص بھی اس طرح دور ہو سکتا تھا:

اسیر زلفِ صنم کے ہیں ایک مدت سے

ہمارے دل کا بھلا کس طرح سے بل جائے

ایک غزل کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔ اس پوری غزل کے دوسرے مصرعوں میں صنعتِ تکرار نے لطف پیدا کر دیا ہے۔ غزل میں روانی اور آمد ہے۔ شوکت کی دوسری غزلوں سے یہ غزل زیادہ چست اور مزیدار ہے:-

کیا جوشش پہ دیدۂ پُر آب ہے واللہ　　سیلاب ہے سیلاب ہے سیلاب ہے واللہ

فرہاد کا خوں دامنِ کہسار میں کیا خوب　　سنجاب ہے سنجاب ہے سنجاب ہے واللہ

ہر لختِ جگر اشک کے دریا میں ہمارے　　سرخاب ہے سرخاب ہے سرخاب ہے واللہ

کیوں کر نہ ادب ہو مجھے ابروئے صنم کا　　محراب ہے محراب ہے محراب ہے واللہ

مت کاکلِ پُر پیچ کو دے پیچ بہت دل　　بیتاب ہے بیتاب ہے بیتاب ہے واللہ

کہتے ہیں دُرِ اشک کو شوکت ترے اب لوگ

خوش آب ہے خوش آب ہے خوش آب ہے واللہ

تصانیفِ شوکت

تذکرۂ آثار الشعراء کے مصنف حافظ ممتاز علی عاقل اپنے تذکرے میں نواب شوکت کی نسبت لکھتے ہیں:

"میاں صاحب بڑے ذہین و متین ہیں اور ہر فن میں ان کی بہت کتابیں تالیف ہیں۔ روز و شب تصنیف و تالیف کا چرچا رہتا ہے۔ فارسی اور اردو خوب لکھتے ہیں۔ میرے پاس نواب شوکت کی حسب ذیل کتابیں موجود ہیں:-

۱- دیوانِ شوکت اردو

۲- گلدستۂ نرگس

۳- تذکرۂ فرح بخش

۴۔ مراسلاتِ شوکت

۵۔ چار باغِ شوکت

۶۔ شہنشاہ نامہ شوکت

۷۔ انشائے نورِ چشم

۸۔ ہفت خوان شوکت

۹۔ قرابادینِ شوکت

۱۰۔ باز نامہ

۱۱۔ فرس نامہ

۱۲۔ فیل نامہ "

نواب شوکت کی ایک کتاب 'ہفت خواں شوکت' ہے، یہ بھی ان کی اکثر تصانیف کی طرح اردو میں ہے اور مطبع حسینی رام پور میں چھپی ہے، اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کھانوں کے بڑے شوقین تھے۔ کھانے عمدہ عمدہ کھاتے اور پکواتے تھے، ان کے یہاں بہترین پکانے والے ملازم تھے، اس کے علاوہ وہ خود بھی اپنے شوق سے کبھی کبھی کوئی چیز پکایا کرتے تھے۔ ان کا دسترخوان وسیع اور پُرتکلف رہتا تھا۔ خوش حال اور فارغ البال تھے، حوصلہ بلند تھا، سیرچشمی اور فیاضی قدرت نے عطا کی تھی۔ اس کتاب کے آغاز میں حمد و نعت کے بعد لکھتے ہیں:۔

" امابعد بندۂ درگاہ رب العزت یار محمد خاں شوکت بفضلِ تعالیٰ اباً عن جدٍ (باپ داداؤں کے زمانے سے) مرفہ الحال فارغ البال ہے اور شائق اطعمہ (طعام کی جمع) لطیفہ و ذائق اغذیہ (غذا کی جمع) نظیفہ ہیں، بے قیلٌ قال ہے۔ جس قدر کھانے کھائے اور شوقیہ خود پکائے اُن کو ان اوراق خوش خوراک لوگوں کے لئے لکھ دئے اور اکثر کھانے جن کا پکانا اور خاطر خواہ روپیہ صرف کرکے کھلانا دشوار اور بعض علی العموم کھانوں کا لکھنا بیکار ہے، متروک کیجے۔ جو صاحب ان میں سے کسی کھانے کو کھا کے حظ و لذت اُٹھائیں مؤلف کو بدعائے خیر یاد فرمائیں اور نام اس کا ہفت خوان شوکت ہے۔" .... یہ رسالہ سات فصل پر شامل ہے۔

صفحہ ۳۳۹ پر دسترخوان آراستہ کرنے کی ترکیب و تہذیب ملاحظہ ہو:

" اول مکان لطیف اور مصفا، جھاڑ فانوس سے مجلّا (روشن) تجویز کرکے دسترخوان صاف لطیف، شفاف، درمیان میں بچھاویں، اور آلات روشنی اور گلدستہ گلہائے خوشبودار و رنگین اس پر نصب کرکے اس پر کھانا طرح طرح کے ظروف چینی، غوری و کاشانی و رومی و بلوری میں دسترخوان پر چُن کر اہلِ دعوت کے ہاتھ پاک کرا کر اوپر دسترخوان کے دو رُخہ روبرو بٹھاویں، اور اجازت تناول طعام کی دیں اور مردم انتظام معروز پاکیزہ لباس دیکھتے جاویں کہ جس چیز کی طعام اور آب سے حاجت دیکھیں، طعام لطیف اور خوشبودار آگے مہمان کے حاضر لادیں۔ جب سب طعام سے فارغ ہوں، صابون اُبٹنا سے ہاتھ صاف کرائیں اور محفل میں لاکر بٹھائیں اور چاء اور قہوہ پیش کریں۔ اور رقص و ناچ دکھائیں اور بعدہٗ تحفہ جات لائق دوستان کے گذرانیں اور عطر و پھول پان و قلیان (حقہ) کی تواضع کرکے رخصت فرماویں۔ زیادہ والسلام "

شوکت کی تحریروں اور اُن کی نسبت دوسروں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے شرفاء اور رئیسوں میں جو جو خوبیاں اور کمالات ہوتے تھے، وہ سب نہیں تو اکثر نواب شوکت میں موجود تھے۔ وہ خوب صورت، تنومند اور تمام مردانہ حسن سے آراستہ تھے۔ دوہرا بدن، داڑھی مقطع اور خوش نما، خوش لباس، خوش پوشاک، کھانے عمدہ عمدہ کھاتے، پکواتے اور اپنے احباب اور مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ طالب مختلف مقامات سے اُن کے احباب اور صاحب حاجت و طالب امداد لوگ اُن کے یہاں آتے رہتے تھے۔ نواب شوکت اپنی اور اُن کی حیثیت کے موافق خاطر مدارات کرتے، مالی امداد اور انعام اکرام سے سرفراز فرماتے۔ سخی، دریا دل سیرچشم رئیس تھے۔ بہادری، شہسواری اور فنونِ سپہ گری میں بھی ماہر تھے۔ شکار کے بھی شوقین، رقص و نغمہ کے قدردان اور رسیا۔ اسی کے ساتھ اپنے دَور کے اچھے ادیب اور انشاء پرداز مصنف اور عالم و فاضل تھے۔ فنِ طب اور خوشنویسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار نے اچھے اچھے استادانِ فن سے تعلیم و تربیت دلوائی تھی،

اُردو کے دلدادہ تھے۔ ان کی تمام تصانیف اُردو میں ہیں، نظم میں کم اور نثر میں زیادہ ہیں، عبارت قافیہ اور کم اور سادہ زیادہ ہے۔

آخر عمر میں دُبلے پتلے ہو گئے تھے اور غالباً دماغ میں بھی کچھ خرابی آ گئی تھی۔

آخری دَورِ حیات

راقم الحروف (مُومی) نے اپنے بچپن اور ان کی پیرانہ سالی میں بارہا اس انداز سے دیکھا کہ روزانہ شام کو وہ پیدل بازار میں ایک چکر لگاتے۔ ایک ملازم یا کوئی مصاحب ساتھ رہتا تھا۔ ہر روز نئے انداز کا لباس زیبِ بدن ہوتا۔ پائجامہ کبھی تنگ موری کا پہنے ہوتے اور کبھی چوڑے پائنچوں کا۔ کبھی چوڑی دار گھٹنا اور کبھی پتلون، کبھی برجس، پائجامہ کا ایک پائنچہ سُرخ، ایک کاسنی، اور ایک ہرا تو ایک اودا یا پیلا۔ انگرکھے کی آستینوں میں چاک۔ ایک سلیم شاہی جوتہ نیلے مخمل کا تو ایک لال مخمل کا، ایک ہرا تو ایک سُرخ اسی طرح موزے بھی دو رنگ کے ایک سیاہ ایک سفید وغیرہ کبھی سر پر پگڑی کبھی عمامہ کبھی گول مخمل کی ٹوپی، اور کبھی سنہری لیس ٹکی ہوئی، کبھی ریشمی کام کی کبھی رامپوری کشتی نما، کبھی دو پلّی اور کبھی چوگوشیہ کمر کھی۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی۔ کبھی سفید کبھی مہندی کے خضاب سے سُرخ، گول مقطع، کبھی دراز اور کبھی گل مچھّے والی۔ جسم چھریرا، قد میانہ، چہرہ تقریباً کتابی ناک قدرے چوڑی، رنگ گورا، بزرگوں سے سنا ہے کہ جوانی میں بڑے رنگین مزاج تھے اور رقص و نغمہ کے دلدادہ حسن و جمال کے پرستار تھے۔ آخر کئی بیوی بچوں کو چھوڑ کر ۱۸۔ ماہ اگست ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

آئندہ اشاعت کے متوقع مضمون نگار

راز یزدانی	عرشی رامپوری
عابد سہیل	عائشہ

دل شاہجہانپوری
منوّر لکھنوی

جوش چند محروم	شاد عارفی

شاذ تمکنت

مریمِ نغمہ

تشنگیِ شب، یہ گُل و رنگ، یہ میٹھا بِکھرا
چاند کے سینے میں بُو دیتا ہے سنگیت کنول
رس میں ڈوبا ہوا، سُرتال سے بوجھل بوجھل

•

منظرِ خواب فسُوں ہے تو گرہ ساز کھُلے
پھر سرِ بزم مرا بھید مرا راز کھُلے
مریمِ نغمہ تری لَے میں ہے تعویذِ شفا
ساز کے سینۂ پُرخوں میں دبی ہیں چوٹیں
سُر کے زخموں پہ کوئی نُور کا پھاہا رکھ دے
باندھ ہر تار کے اطراف اُجالے کا حصار
سُر کی سُرگی کے چرن چھُو کے کلیجہ رکھ دے
آنکھ کو حسرتِ خوں نابہ فشانی نہ رہے
ضبطِ فریاد کی جی کھول کے رسوائی کر
ساز یوں چھیڑ کہ اشکوں کو بہانہ مل جائے
یوں دُکھا دل کہ تسلّی کا گُماں ہو جس پر
تری آواز ہے دیپک، تری سانسیں ہیں ملہار
نغمگی گھُل سی گئی ہے تری شریانوں میں
جیسے گُلبن میں ہو ساون کی جھڑی میں جگنو
نرت اِس طرح چمکتی ہے مدھر تانوں میں
رُخ کرے گا یا نگِ سکوں، جلوہ دہِ دردِ نشاط
لبِ ساکت پہ بھی استھائی کے چھِڑنے کا گُماں

دیکھ کر آنکھوں کا یہ جاگتا سوتا سنسار
آ کے رس بس گئیں بدمست اچپل راگنیاں
تجھ کو سنگیت کی دیوی نے دعائیں دے کر
مسکراتے ہوئے رنگوں کی فراوانی میں
نُور کے رمنوں سے بھیجا ہے کرن کے مانند
راگ کے سائے میں سرگم کی نگہبانی میں

•

بارہا خواب کے ہنگام یہ محسوس ہُوا
میرے انفاس میں پڑتے ہیں اُجالے کے بھنوَر
راگنی پیار سے تکتی ہے سرہانے آ کر

•

جب بھی بہکے ہوئے سرشارِ دولتے بادل
پیار سے ٹوٹ کے بدمست چلے آتے ہیں
پل میں ہو جاتی ہیں شرمیلی ہوائیں پاگل
لبِ احساس پہ جم جاتی ہے نغمے کی مٹھاس
نیند بن جاتا ہے آنکھوں میں دھندلکے کا غبار
برگ سے اُٹھتی ہے جب بوند کی پہلی جھنکار
پوچھتا ہے کوئی چپکے سے مسیحا بن کر
تو کسی ساز کا بچھڑا ہُوا نغمہ تو نہیں
کسی مضراب کے سینے کا شرارہ تو نہیں

•

اَن سنی راگنی پچھلے کو سناتا ہے یہ کون
جب فضاؤں سے برس پڑتے ہیں گھائے طرب
ڈوبتا ہے سرِ دریا قمرِ آخرِ شب
موجیں مُقیش کے تاروں میں بدل جاتی ہیں
چرخ پہ لگتا ہے جب اشرفیوں کا انبار
چوٹیاں کوہ کی، سونے سے چمک جاتی ہیں
کھلنے لگتے ہیں سرِ آبِ رواں نیل کنول
صف بہ صف بھونرے چلے آتے ہیں بیکل بیکل
خود بخود جیسے کہیں بھیرویں چھڑ جاتی ہے
چاند کی آخری کرنوں کی صدا آتی ہے

•

کنجِ سرسبز میں آئینِ خزاں کے ہاتھوں
منہ چھپائے ہوئے دامانِ مزارِ گُل میں
سسکیاں بھرتی ہے جس وقت پپیہے کی پکار
کیسے تھم تھم کے سسکتی ہے ہوائے گلزار
پیکرِ شاخ سے جب زیورِ گُل اُترتا ہے
شیونِ برگِ چکیدہ سے چمن گونجا ہے
پُو پھٹے موجِ نسیمِ سحری کے ہمراہ
تتلیاں ست رنگی سوغات لئے آتی ہیں
دیکھ کر خیمۂ نسرین و سمن کا انجام
خس و خاشاک سے گھبرا کے پلٹ جاتی ہیں
ایسے ہنگام کہیں باغ کی دیوار کے پاس
زرد سی راگنی آ آ کے کھڑی رہتی ہے
ایک اک پھول کے لٹنے کی کتھا کہتی ہے

•

میں نے کس کس طرح سنگیت کی پُوجا کی ہے
آسرا کس کا تھا نغمات کے دامن کے سوا
سوچتا ہوں کہ اگر سُر نہ سہارا دیتا
دوش پر وہ غمِ دنیا کی گراں باری تھی
سانس اُکھڑ جاتی مری تھک کے کہیں سو جاتا
ریزۂ آسیۂ شام و سحر ہو جاتا

نسبتِ درد ہے کچھ جنبشِ مضراب کے ساتھ
کوئی چھپ چھپ کے بلاتا ہے پسِ پردۂ ساز
مجھ سے یہ کس نے کیا سات سُروں کا پردہ
میرے دکھ درد کا یہ کون شناسائی ہے
کون غمخوار ہے یہ کس کی مسیحائی ہے

•

ساز پر اُنگلیاں جس وقت رواں ہوتی ہیں
دل کی دیوار سے سر پھوڑتا پھرتا ہے کوئی
ایسا لگتا ہے بدلنے کو ہیں میرے دن رات
جیسے مٹی مری اکسیر میں ڈھل جائے گی
قند ہے جیسے مرے حق میں مرا زہرِ حیات
زندگی گردشِ دوراں سے نکل جائے گی

•

اُف یہ مرمر کے جئے جانے کی بے سود لگن
محبسِ دہر میں کیا قہر ہے سانسوں کا جتن
بے سبب دل کو گماں ہوتا ہے جیسے تُو نے
میرے اشکوں مری آہوں کا سماں دیکھا ہے
تو نے دیکھی ہے مری رات کی گم گشتہ سحر
میری بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں دیکھا ہے
تجھ پہ آئینہ ہے جیسے مرا مجروح شباب
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے مرے زخموں کا حساب

•

مرہمِ نغمہ تری نَے میں ہے تجویزِ شفا
تو مری خاک کو سودائے پرافشانی دے
رخصتِ ہستی کو تمنائے گریبانی دے
سَم سے بھٹکا ہوں کہاں جاؤں بتا دے مجھکو
سینۂ ساز میں چپ چاپ سلا دے مجھکو
اپنی آواز کے شعلوں میں جلا دے مجھکو
جی میں ہے کھوئے ہوئے خوابوں کی تعبیر ملے
راگ کی آگ میں جل بجھنے کی تقدیر ملے

•

منظور الحسن برکاتی

سیّد سراج الدّین احمدؔ

مرزا غالب کی شخصیت اپنی گوناگوں خصوصیتوں، اور رنگا رنگ خوبیوں کے اعتبار سے ایک باغ و بہار شخصیت تھی۔ جو اپنے زمانہ میں محسود روزگار بھی تھی اور مقبول زمانہ بھی۔ اُن کے گرد بہت سی ایسی با کمال ہستیاں جمع ہو گئی تھیں۔ جو اپنی نظیر آپ تھیں۔ مرزا کے اُن سب سے مساویانہ اور برادرانہ تعلقات قائم تھے "رند" ہونے کے باوجود وہ "مرجع کرام و ثقات" تھے، اُن کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ ہندوستان کے دُور دراز گوشوں میں اُن کے واقف کاروں، شاگردوں، عقیدت مندوں اور دوستوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ کوئی "اُمیدگاہ" تھا۔ کوئی "شفیق" اور کوئی "دوست" تھا کوئی "شاگرد" کچھ "عزیز" تھے، کچھ "مشفق"، ان میں بہت سوں کو مکتوب الیہم ہونے کا فخر حاصل تھا اور بہت سے ایسے بھی تھے۔ جن کے نام کوئی مستقل خط تو نہیں ہے۔ لیکن دوسرے احباب کے خطوط میں غالب نے اُن کا تذکرہ محبت و مودّت کے ساتھ کیا ہے اور اُن کے حالات سے غالب پوری پوری دل چسپی رکھتے اور اُن کی ترقی و تنزّل سے متاثر ہوتے تھے۔ غالب کی بھرپور شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے تلامذہ اُن کے دوست احباب، اُن کے مکتوب الیہم اور اور اُن سے موافق یا مخالف تعلق رکھنے والے حضرات بھی محققین غالب کا موضوعِ تحقیق بنے ہوئے ہیں۔ بہت سوں کے حالات منظرِ عام پر آچکے ہیں اور بہت سوں کے ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ بہر حال غالب پر ریسرچ کرنے والے اُن کی تحقیق و تفتیش میں معروف ہیں۔ یہی شوقِ تحقیق آج اس مضمون کے لکھنے کا محرک بن رہا ہے۔

خطوطِ غالب کے مطالعے سے غالب کے دوستوں میں "سراج الدین" نام کی دو شخصیتیں ملتی ہیں۔ ایک مولوی سراج الدین، جن کے نام متعدد فارسی میں خطوط بھی ہیں اور جو غالب کے سفر کلکتہ کے وقت کلکتہ میں مقیم تھے اور غالب کے مخصوص اور محترم احباب میں سے تھے۔ اوائل ۱۸۵۹ء میں دستنبو کا ایک نسخہ بھی غالب نے انھیں بھیجا تھا۔ اور اپنے ایک خط میں جو غلام غوث بے خبر کے نام ہے۔ غالب نے ان کو "مخلص" "صادق الولا" خطابات سے یاد کیا ہے، لیکن ابھی تک یہ بات تشنۂ تحقیق ہے۔ کہ یہ مولوی سراج الدین کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے بعض نے ان کو کان پور کا باشندہ کہا ہے اور بعض لکھنؤ مسکن بتاتے ہیں۔

"قاضی عبدالودود، حواشی آثار غالب علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء میں رقمطراز ہیں:-

"سراج الدین احمد، غالب کے خاص الخاص دوستوں میں تھے (عود صفحہ ۱۶۶) عجب نہیں کہ کان پور کے باشندے ہوں (متفرقات صفحہ ۳ و صفحہ ۸) عبدالکریم میر منشی دفتر کدۂ فارسی یا خلیل الدین خاں یا دونوں سے رشتہ داری ہوئی بھی ہو دور از قیاس نہیں۔ (متفرقات صفحات ۱۸/۲۸، ۲۰، ۲۶، خطوط صفحہ ۳۹۲) جس وقت غالب کلکتہ گئے ہیں۔ یہ امیان دفتر کونسل سے تھے (خط ۳۲) اس کے بعد بھی تہیاں زندہ ہی تھے کہ یہ زینت بخش پیش گاہ و صدر عدالت ہو گئے تھے۔ جناب مہر کا یہ قول کہ کاروبار کے سلسلے میں مقیم کلکتہ تھے (غالب ۱۱۰) صحیح نہیں، گل رعنا کی ترتیب ان کی تحریک سے ہوئی اور اس کا ذکر اس کے دیباچے میں ہے۔ دیوان میں بھی انھیں یاد کیا ہے

یا سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست　　ورنہ غالب می گزید ذوق خز لخوان مرا

. . . . ان کے نام کے ۸ خط پنج میں اور ۱۷ متفرقات میں ہیں۔"

(صفحہ ۵۸، ۵۹۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر)

دوسرے ٹونک والے سراج الدین احمد

ان کے متعلق غالب اپنے اُس خط میں جو ۹۔ نومبر ۱۸۶۵ء کو رام پور سے شمشاد علی بیگ رضوان کے نام لکھا ہے۔ دریافت کرتے ہیں۔

"ہاں بھئی ٹونک والے سراج احمد کا بھی حال لکھنا"

(اردوئے معلیٰ مطبوعہ فاروقی صفحہ ۳۴۲)

یہ قیاس کرنا تو ٹھیک نہیں، کہ اوّل الذکر مولوی سراج الدین احمد اور ٹونک والے سراج الدین احمد، دونوں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے۔ اور یہ خط بقول قاضی عبدالودود صاحب رمضان ۱۲۶۲ھ کے کچھ بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ۱۲۶۲ھ کا مطابق سن عیسوی ۱۸۴۶ء ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن سراج الدین کا انتقال ۱۸۴۶ء کے قریب ہو چکا تھا اور یہ خط جس میں غالب نے ٹونک والے سراج الدین احمد کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۸۶۵ء کا مرقوم ہے۔

زیر نظر مضمون میں انھیں ٹونک والے سراج الدین کے متعلق معلومات پیش کی جارہی ہے۔

سراج الدین، ایک خداترس، صوفی بزرگ تھے۔ اوراد و وظائف کا شغل رکھتے تھے۔ ٹونک کے دوسرے فرماں روا نواب وزیر الدولہ کو ان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اور اُن کا شمار استادانِ فنِ سپہ گری و مرشدینِ وزیر الدولہ میں ہوتا تھا۔ پیرِ طریقت تو نواب وزیر الدولہ کے سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ لیکن اُن کے علاوہ جن اہلِ حال صوفیا سے وزیر الدولہ کو عقیدت تھی اُن میں سراج الدین احمد کا بھی شمار تھا۔ زمانۂ ولی عہدی ہی سے وزیر الدولہ سے سراج الدین احمد کی رسم و راہ تھی۔ اور مسند نشینِ ریاست ہو جانے کے بعد اس عقیدت و احترام میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ابتداً یہ سواروں میں ملازم تھے اور ان کے چچا سید مسعود الدین احمد دیوانِ ریاست تھے جو بعد میں لشکر فیروزی کے رسالدار بنا دیئے گئے تھے۔

۱۲۹۶ھ میں ٹونک اور ٹھکانہ لاوہ کے مابین جنگ ہوئی تو سراج الدین احمد کو بھی ایک رسالہ کا رسالدار بنا دیا گیا تھا، اور یہ طلایہ لشکر بھی کرتے تھے۔ جب اس جنگ میں میاں مسعود الدین، شہید ہو گئے تو سیّد سراج الدین احمد کو سواروں کی افسری دے دی گئی تھی اور اس کے بعد یہ لشکر فیروزی کمپو دویم کے افسر ہو گئے تھے۔ ملازمین فوج کی تنخواہوں کی رقم بالمقطع آپ کو دے دی جایا کرتی تھی اور اس کی تقسیم آپ کی صواب دید پر تھی۔ ساتھ ہی اس کے پرگنہ چھبڑہ میں نواب وزیر الدولہ نے تیس ہزار روپیہ کی جاگیر عطا کی تھی۔ اور ٹونک کے دیہات میں فی گاؤں ایک روپیہ سالانہ اُن کا حق مقرر کر دیا تھا۔

نواب وزیر الدولہ کا معمول تھا کہ وہ سراج الدین احمد کے مکان پر تشریف لے جاتے اور اُن کو مسند پر بٹھاتے، خود مودب مسند کے سامنے بیٹھ جاتے اور مگس رانی کیا کرتے۔ اگر کسی روز تشریف نہ لاتے تو معذرت کے ساتھ بطور تلافی پانچ سو روپیہ نذرانہ پیش کرتے تھے۔ سراج الدین احمد جب کبھی سفر سے واپس آتے تو نواب وزیر الدولہ شہر سے باہر اُن کا استقبال کرتے۔ ان کی سواری کے لئے ہاتھی، گھوڑے، پالکی اور دیگر لوازمہ متعین تھا۔ سراج الدولہ ثابت جنگ، کا خطاب وزیر الدولہ کے دربار سے عطا تھا۔ آخر میں وزیر الدولہ نے عہدۂ احتساب بھی عطا فرما دیا تھا۔ اس وقت ٹونک کا نام دارالسلام محمد آباد تھا اور احتساب کا شرعی عہدہ قائم تھا۔

سیّد سراج الدولہ، نواب وزیر الدولہ کو کس قدر عزیز تھے اور اُن کے ارشادات دربارِ وزیری میں کیا اثر رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس مشہور روایت سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ نواب وزیر الدولہ کی بڑی بیگم نے قلعہ معلیٰ سے باہر نکل کر تفریح کرنا چاہی، لیکن وزیر الدولہ چوں کہ بڑے سخت اور غالی قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ مذہبی رسم و راہ کی بڑی پابندی کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی بیگمات بھی سخت پردہ کی پابند تھیں۔ انھیں قلعہ سے باہر جانے یا سیر و تفریح کی مطلق اجازت نہ تھی۔

ان حالات میں بھلا کس کی مجال تھی کہ وہ اُن سے یہ عرض کر سکے کہ بیگمات کا جی سیر و تفریح کو چاہ رہا ہے۔ یہ بات آدابِ شاہی کے بالکل خلاف تھی۔ آخر کار بیگم صاحبہ کو کسی نے سمجھایا کہ میاں سراج الدولہ کی سفارش سے اجازت مل سکتی ہے۔

میاں سراج الدولہ چوں کہ خاندانی اور شاہی معاملات میں دخیل تھے ہی اور پیر و مرشد بھی تھے۔ اس لئے بیگم صاحبہ نے ان سے یہ درخواست کی اور سراج الدولہ نے وعدہ کیا۔

جب نواب وزیر الدولہ ملاقات کے لئے آئے تو سراج الدولہ نے کہا آپ کے شہر میں "پکا بندہ" ایک مقام تفریح بن رہا ہے۔ بیگمات کو بھی اس کی سیر فرمانے کی اجازت ہونا چاہئے۔ نواب صاحب یہ بات سُن کر خاموش ہو گئے۔ لیکن پیر و مرشد کا فرمان ٹال بھی نہ سکتے تھے۔ چناں چہ فوراً اجازت دے دی اور حکم دیا کہ "قلعہ معلیٰ سے "پکے بندے تک" راستہ میں دو رویہ قناتوں سے پردہ کیا جائے اور بیگمات کی سواری اس طرح قناتوں، قناتوں میں پکے بندے پہنچی جو خوش زمین

میں انتظام ہو گیا۔ قلعہ سے پکے بندے تک چار میل مسافت کو گھیر دیا گیا اور اس اہتمام سے بیگم صاحبہ کی سواری کی پردہ داری کی گئی۔ بیگمات کا قلعہ معلیٰ سے باہر جانے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ جو صرف سراج الدولہ کی خوشنودی کی خاطر عمل میں آیا۔

سراج الدولہ کا عقد نواب صاحب کے ایما سے صاحب زادہ احمد یار خاں کی ہمشیرہ سے ہو گیا تھا۔ صاحب زادہ احمد یار خاں امیر الدولہ نواب امیر خاں کے داماد تھے۔ ان کے والد کا نام زماں خاں تھا۔ زماں خاں کے والد نواب امیر الدولہ کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔

صاحبزادہ احمد یار خاں کو اشرف الامرا عمدۃ الملک کا خطاب تھا۔ ان کا انتقال ۱۳۰۹ھ میں ہوا۔ صاحب زادہ عبدالرحمٰن خاں مرحوم مصنف "رہنمائے شکار" ایہی کے فرزند تھے۔ اُن کی نرینہ اولاد میں صاحب زادہ خلیل الرحمٰن خاں رشید الرحمٰن خاں اور صاحب زادہ حبیب الرحمٰن خاں حیات ہیں۔

سعیدیہ کتب خانہ ٹونک میں (جو اب ڈسٹرکٹ لائبریری ہے) بزبان فارسی "رسالہ ہفدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر" کے نام سے ایک قلمی رسالہ ہے۔ جس کی تصنیف سرکاری سطح پر سر لارنس رزیڈنٹ راجستھان کی تحریک پر عمل میں آئی۔ اس رسالہ میں سراج الدولہ کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ صاحب رسالہ کا بیان ہے کہ ان کے پسر سید احمد کا عقد صاحب زادہ فیض محمد خاں کی دختر سے ہوا۔ لیکن تاریخ ٹونک مصنفہ سید اصغر علی آبرو سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اسی "رسالہ ہفدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر" میں ہے کہ جب سراج الدولہ کا اقتدار اور عروج ریاست میں اتنا ترقی پذیر ہو گیا۔ تو انھوں نے اپنے اس اقتدار کی وجہ سے اہلِ فوج، اہلِ شہر اور اہلِ خاندان پر جبر و استبداد شروع کر دیا جس کی وجہ سے رزیڈنٹ راجستھان تک ان کی شکایتیں پہنچنے لگیں، اور وہاں سے نواب وزیر الدولہ کو توجہ دلائی گئی کہ سراج احمد کو جاگیرات، اور عطیات سے بہت زیادہ نوازا جا چکا ہے۔ رعایائے ٹونک بالعموم اور اہلِ خاندان بالخصوص ان کے مظالم سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ خزانہ سے بہت سی رقومات حاصل کر لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے فوج کی تنخواہیں وقت پر تقسیم نہیں ہوتیں۔ ٹونک سے اخراج کر کے ان کو آگرہ بھیج دیا جائے، جاگیر ضبط کی جائے۔ تنخواہ صرف تیس روپے کر دی جائے۔

سراج الدولہ نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اہلِ فوج کی ایک ماہ کی تنخواہ اپنے ذاتی خزانہ سے ادا کر دی اور فوج والوں کو راضی کر لیا، ان سے ایک دستاویز راضی نامہ کی لکھوالی، نواب وزیر الدولہ نے یہ کاغذات رزیڈنٹ راجستان کو بھیج دیئے اتفاقاً اسی زمانہ میں وہ رزیڈنٹ ولایت چلا گیا، اور اس طرح یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں نواب وزیر الدولہ کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ نواب محمد علی خاں مسند نشین ریاست ہوئے۔

مسند نشینی سے متعلق جو سیاسی جلسۂ مشاورت منعقد ہوا۔ اس کی صدارت سراج الدولہ نے کی، نواب محمد علی خاں مسند نشین ہونے کے بعد اپنے پدر بزرگوار کے اسوہ کی پیروی میں سراج الدولہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور نذر پیش کرتے ہوئے اظہار عقیدت کیا۔

سراج الدولہ نے بطور تعلی کہا کہ یہ ریاست میری ہے۔ حضور مرحوم نے اس کی سند مجھے لکھ دی ہے۔ مگر میں نے تم کو مسند نشین کر دیا۔ یہ بات نواب محمد علی خاں کو ناگوار گزری اور وہ خاموش واپس آ گئے۔

کچھ عرصہ بعد نواب محمد علی خاں نے احکام جاری کئے کہ اہلِ فوج کی تنخواہ کی رقم یک جائی طور پر سراج الدولہ کو نہ بھیجی جایا کرے، بلکہ اسم وار بخشی فوج سید نور العابدین کے مواجہ میں تقسیم ہوا کرے۔ سراج الدولہ اس تقسیم کے مانع ہوئے جس سے مزید بدمزگی پیدا ہوئی اور نواب محمد علی خاں کی ناراضگی میں اضافہ ہوا۔ نواب صاحب نے سید سراج الدولہ کا لوازمہ ہاتھی، پالکی اور گھوڑے، وغیرہ بند کر دیا۔

سراج الدولہ نے اپنے ہم زلف صاحبزادہ جمال خاں اور عبداللہ خاں کے ذریعے نواب محمد علی خاں سے تعلقات میں ہمواری پیدا کی۔

رسالہ مذکورۂ صدر میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد سید سراج الدولہ ایک روز نواب محمد علی خاں سے تخلیئے میں ملے اور عرض کیا کہ حضور کے یہاں روپے کی ضرورت ہے۔ کچھ روپیہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے اپنے معتمدین چوبدار اور افسران کو ان کے ساتھ کر دیا۔ لیکن بعد میں سراج الدولہ نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا اور اہلِ خاندان کو نواب محمد علی خاں کے خلاف ابھارنا چاہا۔ بالآخر نواب محمد علی خاں نے ان کو ٹونک سے جلاوطن کر دیا اور مکان و جائیداد سب بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ مکان کی تلاشی لی گئی تو تین لاکھ روپیہ اور اشرفیاں برآمد ہوئیں جن کو چھکڑوں میں بار کر کے خزانۂ ریاست میں داخل کیا گیا۔

سراج الدولہ ٹونک سے اخراج کے بعد آگرہ پہنچے اور وہاں رزیڈنسی میں داد خواہ ہوئے پھر کلکتہ گئے اور دو تین سال وہاں کوشاں رہے۔ لیکن جب کہیں کامیابی نہیں ہوئی تو بے پور میں اقامت گزیں ہو گئے اور بقیہ عمر وہاں بسر کی۔ آخر میں

نواب ابراہیم علی خاں نے صاحب زادہ احمد یار خاں کی جاگیر سے ان کے بیوی بچوں کا ایک سو تیس روپے وظیفہ کر دیا تھا۔

سراج الدولہ کا انتقال ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ مرزا غالب اس وقت رام پور میں مقیم تھے اور رام پور ہی میں ان کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے شمشاد بیگ رضواں کو لکھا۔

"ہاں بھئی ٹونک والے سراج احمد کا حال بھی لکھنا۔"

یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ سراج الدولہ سے مرزا غالب کے کب اور کس طرح تعلقات قائم ہوئے اور شمشاد بیگ رضواں سے سراج الدولہ کی کیا قرابت تھی۔

لیکن یہ بات ضرور ہے کہ غالب کے تعلقات سراج الدولہ سے بہت قریبی تھے۔ وہ اس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور نواب محمد علی خاں سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس کی غمازی ان کا وہ خط بھی کرتا ہے جو انھوں نے مولوی محمد حسن خاں مالک مطبع مدیر اخبار دبدبۂ سکندری کو لکھا ہے۔ خط حسب ذیل ہے۔

"شفقی او مکرمی محمد حسن خاں صاحب کو غالب آزردہ کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھیرے کئی خط آپ کے پھیرے، اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی آپ کا خط خط تھا یا کوئی جھوٹ کی پوٹ، بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ اور جو کچھ سمجھ میں آیا وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ یہ غلط محض ہے کہ مطبع حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو۔ حضور کی طرف سے انشاء اللہ بجے سنگھ کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ کرتے ہو۔ اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے بادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام (کے) آگے، یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو ہیں وہ اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے تو گویا بجے سنگھ کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہو گی ہندوستانی عملداری میں وہ ایک زمیندار اور مال گذار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو بھائی "ایک در گیر و محکم گیر" اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم تو آخر رعیت تو ہو، یہ کیا ہے۔ اپنے بادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو، کبھی صفحہ پر کبھی حاشیہ پر۔ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمھارا اخبار موقوف کیا اور اب پھر تمہیں لکھتے ہیں کہ دو ہائی خدا کی۔ یکم جنوری ۱۸۶۸ء سے دبدبۂ سکندری کا خریدار نہیں ہوں، نہ بھیجو کرو، واسطے خدا کے، نہ بھیجا کرو۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔"

(مہر غالب ۱۸۶۸ء) ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء

(مکاتیب غالب ص ۱۱۱)

یہ خط مرزا غالب نے ۱۸۶۸ء میں لکھا ہے۔ جب کہ نواب محمد علی خاں معزول ہو کر بنارس جا چکے تھے۔ اور اس واقعہ کو ایک سال گذر چکا تھا۔ نواب محمد علی خاں کی معزولی ۱۸۶۷ء میں لاوہ کے ٹھاکروں کے قتل کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ غالباً دبدبۂ سکندری میں نواب محمد علی خاں کی ہمدردی میں مدیر اخبار نوٹ لکھا کرتے ہوں گے۔ جو غالب کو ناگوار گزرتا تھا۔

ورنہ اس سے پہلے نواب محمد علی خاں کی مسند نشینی کے موقع پر خود غالب نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں اپنی قدیمی نیاز مندی کا اظہار کیا۔

نہ غالب کہ از روزگار دراز

برش غتبہ سایدجبین نیاز

نواب محمد علی خاں کے پدر بزرگوار نواب وزیر الدولہ بھی غالب کے ممدوحین تھے اور غالب نے ان کی شان میں دو قصیدے لکھے ہیں۔

سراج الدولہ کے آبا و اجداد بہ عہد عالم گیر پشاور کے ایک ضلع کوہاٹ سے لاہور آکر اقامت گزیں ہوئے تھے۔ وہاں سے ان کی اولاد ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلی۔

یہ بات بھی ابھی تشنۂ تحقیق ہے کہ سراج الدولہ ٹونک کس طرح اور کس سن میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد میں سے کوئی رام پور بھی آیا اور رام پور سے یہ خاندان ٹونک پہنچا۔

اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ صاحب تذکرۂ کاملان رام پور نے صفحہ ۳ پر میاں غلام مرشد کے حالات کے ذیل میں سراج الدین احمد کے والد کے نام کے ساتھ رام پوری لکھا ہے۔ تذکرۂ کاملان رام پور کی عبارت یہ ہے۔

"میاں سراج الدین احمد ولد سید احمد رام پوری سے اسی طرح نواب صاحب (محمد علی خاں) نے تین لاکھ روپے وصول کر لئے۔ نواب وزیر الدولہ ان کے بھی معتقد تھے۔"

اور پھر یہ کہ اس زمانہ میں اکثر اہلِ علم اور اہلِ کمال ٹونک میں رام پور ہی سے آئے تھے۔ اس طرح ٹونک اور رام پور میں ایک قسم کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے چچا سید مسعود الدین احمد کے نام کے ساتھ بھی تاریخ ٹونک میں مصطفیٰ آبادی مرقوم ہے یہ بات بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ سراج الدین کا خاندان رام پور ہی سے ٹونک آیا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ کس سن میں ٹونک پہنچے۔ تو اس کا تصفیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ان کا مصنفہ ایک قلمی رسالہ بزبانِ فارسی "عشر و خراج" خال محترم مولانا حکیم سید ظہیر احمد صاحب بگلتی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کا سن تالیف ۱۲۵۰ھ ہے اور یہ وہ سال ہے جب کہ نواب وزیر الدولہ مسند نشین ہوئے ہیں

سراج احمد اس رسالہ کا سبب تالیف اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"اما بعد میگوید احقر عباد اللہ المتقین، ارادت آسن مقبول لان احمد الصمد، سراج الدین احمد، کہ روزے از روز ہائے ماہ شوال سنہ یکہزار و دو صد و پنجاہم، در قصبہ ٹونک اندرون قلعہ مبارک در خدمت نواب مستطاب مبادی آداب، معلی القاب، اقدس جناب ارفع رکاب حضرت وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خاں بہادر، نصرت جنگ لازوال ملکہ و حشمتہ مغتنم بودم، شبے از شبہائے مذکور در اثنائے مکالمہ شرف جواب بخشیدہ از راہِ غربا پروری و فقرا نوازی و رعایا آبادی فرمودند کہ ما بدولت را خیالے بود کہ در تمام رعیت وضیع و شریف احکام شرعی جاری نمایم، لاکن میسر نگشت، فقیر عرض نمود کہ خیر خواہ دولت بہ اتصال را نیز ہمیں خطرہ خطور و مضمر بود کہ گاہے مسبب حقیقی بیپائے زد کہ چند کلمات نافع دین و ملت و دافع شرک و بدعت عرض حضور فیض نشور نماید لاکن بحکم آں کہ کل امرٍ مرہونٌ باوقاتہا موقوف در پردہ تعویق ماندہ۔

الحمد للہ کہ دولت بیدار و بخت ساز گاریاوری نمود کہ تمام مدارج دلی بحصول انجامید، الحال امیدوارم کہ در تمام قلمرو حضور احکام شرعیہ و احتساب توبہ جاری گردد، نواب ملائک آیاب از کمال صفائی قلب و بشاشت طبع فرمود انشاء اللہ تعالیٰ زود سرانجام ایں امر بہ خوبی اہتمام خواہد پذیرفت، باز فقیر عرض نمود کہ رقم وجوہ سائر بالکل موقوف گردد، و محاصل زمین عشری یا خراج اخذ شود حکم رفت کہ زمین عشری کدام و خراجی کجا، دراں وقت ضیق جواب طویل مناسب گذارش ندانستہ موقوف بر وقت دیگر گذاشت۔

الحمد للہ کہ الحال سعادت یاور و ہدایت مددگار بود کہ بسبب جذبہ توجہ باطنی نواب مستطاب رسالہ زمین عشری و خراجی نسخ نمودہ موجزاً و مجملاً بخدمت فیضدرجت ہمت گذارش نمود، گر قبول افتد زہے عز و شرف"

یہ کتاب سراج الدولہ کی علمی قابلیت پر بھی دال ہے۔ اور اس سے کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سراج الدولہ سنہ ۱۲۵۰ھ سے پہلے ٹونک پہنچ چکے تھے۔ یہ رسالہ شوال میں مکمل ہوا اور غالباً اس کی تصنیف کے بعد ہی نواب وزیر الدولہ نے ان کو عہدۂ احتساب عطا فرمایا گیا۔

ٹونک میں سراج الدولہ کا مکان محلہ موتی باغ میں تھا۔ پرانے واقف کاروں کا بیان ہے کہ سراج الدولہ کے ٹونک سے اخراج کے بعد ان کا رہائشی مکان نواب محمد علی خاں نے صاحب زادہ محمود خاں تہور جنگ کو دے دیا تھا۔ جب اُس مکان کو کھدوایا گیا تو اُس کی دیواروں میں سے کافی روپیہ برآمد ہوا۔

سراج الدولہ کے مکان کی جگہ اب ایک بہترین خوشنما حویلی تعمیر ہے جو صاحب زادہ محمود خاں کی تعمیر کردہ ہے۔ تاریخ تعمیر ۱۳۵۲ھ ہے۔ صاحب زادہ محمود خاں کے پوتے صاحب زادہ عبد المجیب خاں اسی میں رہتے ہیں۔

سراج الدولہ کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ ان کی اولاد میں سے صرف ایک نواسی بقیدِ حیات ہے۔ ان کے چچا زاد بھائی کپتان سید نور الدین احمد المخاطب بفصیح الملک، ٹونک میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور ان کی اولاد میں سے سید عزیز الدین احمد اور کپتان سید سیف الدین احمد وغیرہ ٹونک میں موجود ہیں۔ سیف الدین احمد عرصہ تک رسالہ کے کپتان رہے۔ ریاست کی جانب سے معافی اور جاگیر عطا تھی۔ خاندان کے بعض افراد ملک کی تقسیم کے بعد ترکِ وطن کر کے کراچی چلے گئے اور وہاں لالو کھیت میں مقیم ہیں۔

خاتمۂ کلام

بہر حال سراج الدولہ ثابت جنگ بہادر یا میاں سید سراج الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ یا مولوی سراج احمد کسی نام سے پکارا جائے، ٹونک کی ناقابلِ فراموش ہستیوں میں سے تھے۔ اُس دور کے بیشتر بزرگ صاحب سیف و قلم ہوتے تھے اور تزکیۂ نفس کے لئے صوفیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

مولوی سراج احمد کو خدائے تعالیٰ نے اُن کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے

اس قدر ترقی دی کہ شوکت و اقبال و اختیارات میں وہ اس چھوٹی سی ریاست خداداد میں جعفر برمکی وزیر اعظم خلیفہ ہارون رشید کے درجہ پر پہنچ گئے۔ لیکن یہ حُبِّ جاہ و مال کس طرح کا طالبِ دہر کو ہلاک کرتا ہے اور خسران کے گڑھوں میں ڈال دیتا ہے سراج الدولہ کا عروج و زوال اس کی لازوال مثال ہے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری جہت میں بھی سنتِ اللہ کار فرما ہے۔ یعنی وہ اپنے بندگانِ خاص سے ناراض ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ظلم و تحقیر کو روا نہیں رکھتا سراج الدین احمد، درحقیقت اُن محسنوں میں سے تھے، جنھوں نے نواب امیر الدولہ کے بعد ریاست کو سنبھالا، مخصوص فوجی افسروں کا گٹھ جوڑ تھا۔ جس کے سربراہ جنرل مختار الدولہ محمود خاں تھے۔ کہ گدی نشینی کی رسم جب قلعہ میں ادا ہونے والی تھی اور گدی کے ایک طرف صاحب زادہ وزیر محمد خاں اور ایک طرف صاحب زادہ عبدالکریم خاں کو توقع تھی کہ ریاست کا وارث مجھے قرار دیا جائے گا اور تھوڑی دیر کے بعد اس گدی پر میں بیٹھوں گا کہ اتنے میں مختار الدولہ محمود خاں نے صاحب زادہ وزیر محمد خاں کو کہنی سے گدی پر دھکا دیا اور وہ ابھی سنبھل کر پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے۔ گدی پر صرف کہنی ہی ٹکی تھی۔ کہ جنرل محمود خاں نے افسر توپ خانہ کو اشارہ کیا اور اس کے منہ سے نکلا "فیر" اور قلعہ کے میدان سے سلامی کی توپ چل گئی۔ فوراً سپہ سالار افواج جنرل مختار الدولہ نے وزیر محمد خاں کو نذر پیش کرکے نواب وزیر الدولہ بنا دیا۔

صورتِ حال دیکھ کر صاحب زادہ عبدالکریم خاں غصہ سے اٹھے اور قلعہ سے بالکل باہر نکل کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ پرگنہ چھبڑہ کا رُخ کیا۔ اور پرگنہ پر قبضہ کرکے اپنی نوابی کا اعلان کر دیا۔ نواب عبدالکریم خاں کے مقابلہ کے لئے فوج بھیجی گئی۔ قلعہ گوگو فتح ہوا۔ اور ریذیڈنٹ آبو کے بیچ میں پڑنے کے بعد نواب عبدالکریم خاں کا ریاست سے وظیفہ مقرر ہوا۔ اور انھوں نے اجمیر میں سکونت اختیار کرکے محلہ نواب کا بیڑہ بسایا۔

نواب وزیر الدولہ کے ابتدائی عہد کے سخت حالات میں میاں سراج احمد سے درویش، علم دوست اور بہادر رفیقوں ہی نے وزیر الدولہ کو وزیر الدولہ بنایا تھا اور اسی سبب سے نواب ممدوح ان بزرگوں کے ممنونِ کرم تھے۔

نواب محمد علی خاں، سپاہی دماغ، عالم طبیعت (اور بعد میں درویش دل) انسان تھے۔ رئیس ہونے کے بعد انھوں نے ان تمام اثرات کو ریاست سے ختم کرنے کی تیزی سے کوشش کی، جو افسرانِ فوج اور دیگر ذی اقتدار متنفّذین قائم کرکے تھے۔

وہ انگریزی تسلط کے خلاف بھی تھے اور ان کی پرجوش مجاہدانہ طبیعت کی خبریں انگریزوں کو پہنچتی رہتی تھیں۔ ٹھاکر وہ کے قتل کو بہانہ بنا کر بالآخر انگریزوں نے انھیں ریاست سے معزول کرکے بنارس میں قید کر دیا۔ اور سراج الدولہ کے زوال، توہین اور دل آزاری کا نتیجہ اس طرح رونما ہوا۔ یہ ہے پس منظر مرزا غالب کے اس فقرہ کا "ہاں بھئی ٹونک والے سراج احمد کا حال بھی لکھنا۔"

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مجید انجم ساگری

غزل

رہ جائے گا رہِ رو گم گشتہ کا نشاں اور
تم آگ بجھا دو گے تو اُٹھے گا دھواں اور

اللہ سلامت رکھے اب اس کی جوانی
بے تاب ہوئی جاتی ہے امیدِ جواں اور

للہ نہ ٹھکرایئے ٹھکرائے ہوئے ہیں
ہم آپ کا در چھوڑ کے جائیں گے کہاں اور

مجھ کو تو یقیں ہے مگر اس دل کو کروں کیا
وعدے پہ نہ آئے تو گزرتا ہے گماں اور

دیوانگیٔ شوق میں عالم ہے یہ اپنا
کہتی ہے نظر اور تو کہتی ہے زباں اور

گردش میں ہے انجمؔ تو نہ کر شکوۂ قسمت
کر دیں گی یہ رسوا تجھے فریاد و فغاں اور

ڈال ڈال کے پات

لکھنؤ کا ایک طرحی مشاعرہ

وزیر اعلیٰ شری سمپورنا نند متخلص بہ آنند مسٹر جسٹس آنند نرائن ملا۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، جناب افقر موہانی اور جناب مجنوں گورکھپوری ان شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے ایک مخصوص طرحی مشاعرہ ۔۔۔ میں جو ممبر بورڈ آف ریونیو۔ یو۔ پی مسٹر اے ایس پیرو کے یہاں ہوا غزلیں سنائیں۔

اس کامیاب ترین مشاعرے میں جن شعراء کو خاص طور پر داد ملی۔ ان میں مذکورۃ الصدر شعراء کے علاوہ عمر انصاری حبیب احمد صدیقی اور سنہا صاحب قابل ذکر ہیں۔

ہزل کے دور میں ماچس لکھنوی نے سب سے زیادہ داد حاصل کی۔

مسٹر پیرو کے یہاں پنچ بنگلیہ میں ٹھیک ڈیڑھ بجے طرحی مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی صدارت ۴ بجے تک مشہور نقاد، افسانہ نگار اور شاعر جناب مجنوں گورکھپوری نے کی۔ سہ پہر کے بعد مسٹر جسٹس آنند نرائن ملا شہر کے کہنہ مشق، صاحب طرز اور ممتاز شاعر نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

حاضرین میں خواتین کی معقول تعداد کے علاوہ وزیر مالیات حافظ محمد ابراہیم چیف سکریٹری یو پی۔ شری اے۔ این جھا سکریٹری محکمۂ مال مسٹر ظہور الحسن ممبر بورڈ آف ریونیو سیتہ مدیق حسن ہری ٹیکس کمشنر مسٹر ایم۔ ایم صدیقی ڈاکٹر عبد الحمید سید حامد حسین اسلم اور شیخ ظہیر حسن وغیرہ رونق محفل تھے۔

دو طرحیں مشاعرے کے لئے رکھی گئی تھیں ایک چھوٹی بحر میں کہ

دل حریص متاعِ جہاں ہے

اور دوسری بڑی بحر میں کہ

میں سب کو پہچانتا ہوں لیکن مجھے کوئی جانتا نہیں ہے

سب سے پہلے جام لکھنوی نے چھوٹی بحر میں اپنی غزل سنائی، اور اُن کے حسب ذیل شعر پہ مشاعرے میں رونق آتی نظر آئی۔

مہرباں اس پہ کیا ہو زمانہ جس پہ لے دوست! "تو مہرباں" ہے

عبود نا پادی نے بڑی بحر میں غزل سنائی اور اُن کا جو شعر خاص طور پر پسند کیا گیا وہ یہ ہے

نگاہِ شاعر گئی تو لیکن ہر ایک محفل سے لوٹ آئی
سوالِ مہر و وفا ہے لیکن جواب مہر و وفا نہیں ہے

ساحر لکھنوی نے چھوٹی بحر میں معاملات حُسن و عشق کو بیان کیا اور حُسن پر عشق کی برتری اس طرح ثابت کی۔

حُسن ہے عکسِ حُسن نظر تک عشق پائندہ ہے جاوداں ہے

ان ہی کا دوسرا شعر بھی خاص توجہ کا مستحق بنا

کب پہنچتا ہے منزل پہ دیکھیں راہ گم کردہ ہر کارواں ہے

جناب دشنو کمار شوق کے مطلع ہی نے حاضرین کی توجہ خاص طور پر اپنی طرف کھینچ لی۔

کون سا راز اس کا نہاں ہے اک فریب نظر درمیاں ہے

شوق کے اس شعر نے خوب داد حاصل کی

لاکھ گلچیں سنوارے قفس کو آشیاں پھر مرا آشیاں ہے

عرفان لکھنوی نے بڑی بحر کو اپنے نتائج افکار کے لئے چُنا اور بڑی روانی سے غزل سنائی ان کا یہ شعر خاص طور پر چمکا۔

کہاں کے جام اور کہاں کے ساغر کہاں کی صہبا کہاں کی مستی
میں کس لئے میکدے میں جاؤں تری نگاہوں میں کیا نہیں ہے

مستی عثمانی نے چھوٹی بحر میں اچھے اچھے شعر سنائے مثلاً

جستجو مجھ کو اپنی ہے ورنہ — یہ تو معلوم ہے تو کہاں ہے
دل میں آکر بھی ان کا یہ عالم — جیسے کوئی ابھی درمیاں ہے
اک تبسم بھی فرصتِ گل — اک تبسم بھی اک داستاں ہے

خاور صدیقی کی غزل کے بعد شمبھو دیال شفق کے دو شعر خاص طور پر مقبول ہوئے

مرے بھروسے پہ دنگ ہو کر ٹھہر گئیں گردشیں جہاں کی
جلے نشیمن کو کہہ رہا ہوں "مرا نشیمن جلا نہیں ہے"
قیامت اس کی نظر کی تابع نظام کونین اس سے لرزاں
بشر بشر ہی تو جانے پہلے، بشر کی قدرت میں کیا نہیں ہے

قائم سیدن پوری نے اپنی برتری یہ کہہ کر ثابت کی۔

بچا کے دیر و حرم سے دامن چرا کے بزم بتاں سے نظریں
وہاں پہ سجدہ طراز ہوں میں جہاں کوئی نقش پا نہیں ہے

اور ان کے یہ اشعار بھی مقبول ہوئے:

تباہ ہو کر رہِ وفا میں میں حرفِ الفت سمجھ سکا ہوں
جو لذتِ غم سے بے خبر ہے وہ دل سکوں آشنا نہیں ہے
غم محبت غم زمانہ غم حیات اور غم ندامت
ترے تجسس میں کیا نہیں تھا ترے تجسس میں کیا نہیں ہے

انجم شاہانی کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

پہلے غم کا تصور گراں تھا — اب لبوں پر تبسم گراں ہے

شاکب لکھنوی نے تغزل میں طنز کے نشتر چھپا کر جب مطلع پڑھا تو محفل بہت محظوظ ہوئی ؎

یہ بات کہنے کی کہہ رہا ہوں مگر کسی کا گلا نہیں ہے
اب ان کا دستِ کرم بڑھا ہے جب اپنا دامن بچا نہیں ہے
وفا پرستوں سے ہیں وہ اچھے جنھیں شعورِ وفا نہیں ہے
انھیں محبت ملی ہے لیکن غم محبت ملا نہیں ہے

مظہر الٰہ شاہانی نے تحت اللفظ غزل سناتے ہوئے جب یہ شعر پڑھا تو حاضرین نے ابھی داد دی۔

مزاج جن کا ہے آسماں پر کچھ اس طرح دیکھتے ہیں ہم کو
یہی ہیں جیسے خدا کے بندے ہمارا کوئی خدا نہیں ہے

اقبال ادیب نے بھی کامیاب غزل پڑھی اور ان کے دو شعر خاص طور پر داد کے مستحق قرار پائے۔

مجھ پہ شاید کوئی مہرباں ہے — ہر نظر بد گماں بد گماں ہے
ایک ایسی بھی منزل ہے غم کی — ہر تسلی جہاں رائیگاں ہے

ڈاکٹر متین نیازی کے مطلع کے پہلے ہی مصرعہ پر حاضرین متوجہ ہوگئے ؎

خلوص تعمیر ہو جو شامل ستم کا جذبہ برا نہیں ہے
وفا کریں گے وہ کیا کسی سے جنھیں شعور جفا نہیں ہے
تری سمجھ میں نہ آسکے گی کسی کے اشکوں کی قدر و قیمت
ابھی ہے نا آشنائے غم تو، ابھی ترا دل دکھا نہیں ہے

مقبول لکھنوی نے اچھی غزل پیش کرتے ہوئے دو شعروں پر خاص داد پائی۔

اس کی محرومیاں اللہ اللہ — داستاں جو رہین بیاں ہے
حالِ میخانہ کیا پوچھتے ہو — اب تو ہر ایک پیر مغاں ہے

نہال رضوی نے تیوروں کے ساتھ غزل پڑھی۔

کیا حسین واسطہ وہ گماں ہے — جو مرے آپ کے درمیاں ہے
جاگ اے غیرتِ موجِ طوفاں — تو کہاں ہے سفینہ کہاں ہے

ہزار لکھنوی نے مطلع ہی پر توجہ کو کھینچ لیا۔

یہ باخبروں کی منزلت ہے ہر اک اسے جانتا نہیں ہے
ہیں کیوں غم زندگی سے الجھوں غم محبت میں کیا نہیں ہے
صداقتیں آج کیسے مٹیں حقیقتیں رو رہا ہوں کیوں کر
لبوں پہ ذکر وفا ہے لیکن دلوں میں تمیز وفا نہیں ہے

ابوالمجاہد زاہد کی غزل میں ایک شعر نے سب کو لطف دیا ؎

آہ! باوصفِ رنگیں نوائی — میں چمن اور رہنہ باغباں ہے

اس کے بعد نصرت کانپوری نے ایک کامیاب غزل پڑھی مثلاً

جو قفس ہے وہ بار گراں ہے — عشق کی زندگی امتحاں ہے
بڑھ رہے ہیں قدم سوئے منزل — جلوۂ یار دامن کشاں ہے
میری روداد غم سننے والے — یہ نہ کہنا کہ حسن بیاں ہے

حکیم شکیل احمد شمشی نے ان کے بعد تغزل اور تفکر کے امتزاج سے اچھے

اچھے شعر سنائے۔

نگاہِ پیرِ مغاں جو دیکھے تو رند پھر بھی بُرا نہیں ہے
کرہ اکہ بازوں کی مے کشی میں اصولِ صدق و صفا نہیں ہے
حسین تخیل جواں امنگیں غمِ محبت خیالِ جاناں
ہمارا عالم سراب لیکن سکوں کی خاطر بُرا نہیں ہے

مسٹر ایس۔ این سنہا نے ان کے بعد ایسی کامیاب غزل پڑھی کہ ہر ہر شعر پر داد و تحسین کا شور اٹھا۔

یہ سچ ہے دل میں بہت دنوں سے شباب کا ولولہ نہیں ہے
نہ جانے کب یہ بھڑک اٹھے پھر کہ شعلۂ غم بجھا نہیں ہے
وہ شرحِ رازِ غمِ محبت وہ کیف کے دن طرب کی راتیں
یقیں تو ہے خواب ہی تھا لیکن وہ خواب اب بھولتا نہیں ہے
ابھی ابھی کوئی کہہ رہا تھا وہ آتے جاتے ہیں آ رہے ہیں
مگر کوئی یہ یقیں دلائے یہ میرے دل کی صدا نہیں ہے

سروش عسکری نے فوراً بعد ہی غزل سناتے ہوئے داد و تحسین کی فضا کو قائم رکھا۔

زباں تو کیا دل کی ترجماں ہو نگاہ کا حوصلہ نہیں ہے
جو تابِ شرح و بیاں کی لائے وہ شوق کا ماجرا نہیں ہے
غبارِ ذوقِ خود اعتمادی ملا ہے کیا کیا سکون دل کو
کبھی کبھی جب یقیں ہوا ہے کہ اب کوئی آسرا نہیں ہے

عمر انصاری نے ان کے فوراً ہی بعد ایک مرصع اور کامیاب غزل سناتے ہوئے حاضرین سے خوب خوب داد وصول کی ان کے چند اشعار یہ ہیں۔

جہاں ہیں عنوانِ ہر فسانہ، ہے میری ہی خاکِ آشیانہ
مرے لئے گردشِ زمانہ! کوئی بھی غم ہو نیا نہیں ہے
ہے چارہ سازوں کی سعیِ پیہم کہ چین لیں نوکِ مژہ سے شبنم
دبی دبی سی ہو آتشِ غم اسے کوئی پوچھتا نہیں ہے
ستاؤں شکوں کے کیوں فسانے وہ کے ڈھونڈوں میں کیوں بہانے
کرم میں کیا ہوگا کون جانے ستم میں بھی اس کے کیا نہیں ہے

صدرِ مشاعرہ جناب مجنوں گورکھپوری نے پچیس سال کے بعد مشاعرہ میں غزل سناتے ہوئے حاضرین کو چونکا چونکا دیا۔

حُسن و اُلفت کی جو داستاں ہے — کچھ حقیقت کچھ اپنا بیاں ہے
اعتبارِ گل و گلستاں کیا — رنگ و بو بھی اک داستاں ہے
تم سے چھٹ کر گزرتی ہے کیسی؟ — کیا بتائیں! بڑی داستاں ہے

صدرِ مشاعرہ کی غزل کے بعد نمازِ عصر اور چائے کے لئے محفل ملتوی ہوئی دوسری نشست جناب آنند نرائن ملاؔ کی صدارت میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے امینؔ سلونوی نے مختصر اور جامع غزل سنائی۔

اگر یہ سچ ہے کہ اس جہاں میں طویل عمرِ وفا نہیں ہے
کسی کی بے اعتنائیوں کا مجھے بھی کوئی گلا نہیں ہے

احسن طباطبائی نے اس کے بعد جو غزل پڑھی اس کے حسبِ ذیل اشعار زیادہ مقبول ہوئے۔

جفا سے اب تم نہ باز آؤ تمھاری کوئی خطا نہیں ہے
شکایت اپنے ہی بخت سے ہے کسی سے کوئی گلا نہیں ہے
جفا کی بس انتہا وہی ہے جفا میں تاثیر رہ نہ جائے!
مری وفا آزمانے والے وفا کی کچھ انتہا نہیں ہے

طپش لکھنوی کا ایک شعر بہت پسند کیا گیا۔

برق کس کس پہ حملے کرے گی — ہر گلِ تر مرا آشیاں ہے

عرشی لکھنوی نے متعدد اشعار ایسے سنائے جن کو مکرّر سہ کرر پڑھوایا گیا۔

اب کسے خضرِ منزل بناؤں — میں کہیں ہوں کہیں کارواں ہے
سامنے اس کے اٹھے نظر کیا — خود نظر سے نظر بدگماں ہے
بے حقیقت نہیں کوئی جلوہ — پھر بھی حسنِ حقیقت نہاں ہے

انقر موہانی کی غزل خوش الحانی کے ساتھ صابر صاحب نے سنائی جو خیال و بیان ہر پہلو سے پسند کی گئی۔

نفس نفس میں نئی ہے دُنیا، نظر نظر میں نیا ہے جلوہ
نگاہ کی پھر بھی انتہا ہے، جمال کی انتہا نہیں ہے
ہے وہ بھی کوئی جبیں سجدہ اٹھے تمھارے جو نقشِ پا سے
نہ جذب کر لے اگر جبیں کو تمھارا وہ نقشِ پا نہیں ہے
ہزار رنگِ زمانہ بدلے ہزار دورِ نشاط آئے
جو بجھ چکا ہے ہوائے غم سے چراغ پھر وہ جلا نہیں ہے

حبیب احمد صدیقی نے انفر موہانی کی کامیاب غزل کے بعد ہی ایک کامیاب غزل پڑھی جس نے مشاعرے کی فضا کو بدلنے نہیں دیا۔

مہرباں ہے کہ نامہرباں ہے — وہ بہر حال تسکینِ جاں ہے
حادثاتِ زمانہ سلامت — ہر نفس ایک عزمِ جواں ہے
آپ نے دل کو توڑا تو لیکن — یہ بھی سوچا یہ کس کا زیاں ہے
عشق ہے اور اُمنگوں کی دُنیا — عقل ہے اور غمِ جاوداں ہے

سید صدیق حسن نے بڑی بحر میں ایک اچھی غزل پڑھ کر حاضرین سے اپنی فن کاری کا اعتراف کرایا۔

ابھی تو بری نہیں ہیں آنکھیں ابھی تو شکوہ کیا نہیں ہے
ابھی سے شرما رہے ہو کیوں تم ابھی تو کچھ بھی کیا نہیں ہے؟
نگاہ اُٹھ اُٹھ کے جھک رہی ہے زباں وہ رُک کے رُک رہی ہے
یہ کیفیت خود خفا ہو لیکن یہ اعتراف خفا نہیں ہے
اب اس پہ اصرار کی ضرورت یہ مجھ کو تسلیم ناصحا! ہے
کہ اس جہاں میں بجز تمھارے کوئی بھی اب پارسا نہیں ہے

جناب اختر لکھنوی کی کامیاب اور مرصع غزل سرور تش عسکری نے سُنائی تقریباً ہر شعر پر محفل نے خراجِ تحسین پیش کیا لیکن اس شعر نے عجیب فضا پیدا کر دی۔

جہاں کو زنداں کہیں تو کیوں کہ ہزار پابندیوں کے ہوتے
اسیر اس حسن سے کیا ہے کہ شورِ زنجیر پا نہیں ہے
صبا پہ موقوف کچھ نہیں ہے جو خاک اڑاتی ہے در بدر کی
وہ کون گل ہے کہ جس کی نکہت تمھارے لئے پریشاں نہیں ہے

صدر مشاعرہ ملا صاحب نے اس کے بعد وہ غزل سُنائی جو اس سے پچھلے والے مشاعرے کے لئے انھوں نے کہی تھی مگر اس مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

ملا صاحب کی غزل ایک پیغام کی حامل اور درسِ حیات تھی جس میں تغزل سے زیادہ تفکر کی جلوہ سامانیاں تھیں۔

نہ اتفاقِ عمل ہے نہ ایک سمت قدم — ابھی تو بھیڑ ہے یہ اس کو کارواں نہ کہو
یہ اپنا گھر ہے چلو اس پہ تصفیہ کر لیں — قفس کہو نہ لئے ہیں تم آشیاں نہ کہو
جہاں ہر ایک سجدے کا حق نہیں حاصل — لئے خدائے محبت کا آستاں نہ کہو
زمانہ مجھ پہ نہیں تم پہ خندہ زن ہوگا — تم آج دوستو! ملا کو نکتہ داں نہ کہو

سب سے آخر میں وزیر اعلیٰ شری سمپورنا نند جو اپنی غزل اپنے یہاں کے مشاعرے کی طرح میں کہہ چکے تھے اور دوسروں سے پڑھوانا چاہتے تھے حاضرین کے اصرار پہ خود غزل پڑھنے آئے اور حاضرین سے خوب داد حاصل کی۔

بندہ، مولا، عبادت و عصیاں — ان کے گورکھ ہزار افسانے
رازِ وحدت سے خود تو نا واقف — واعظ آیا ہے ہم کو سمجھانے
فیض ہر سو ہے موجزن لیکن — ہم کو مارا ہے خوفِ عقبیٰ نے
مئے آتش اب تو پیتے ہیں — عاقبت کی خبر خدا جانے

اس غزل کے ساتھ غزل کا دَور ختم ہو گیا۔ ہزل کے دور میں سب سے پہلے سر تپٹ لکھنوی نے پڑھا اور اس شعر پہ خاصی داد پائی:۔

کہاں کا ٹٹو، کہاں کا چھپر، کہاں کا چھکڑا، کہاں کا ٹھیلا
تمھارے غم کا جو بوجھ اٹھائے مرے سوا دوسرا نہیں ہے

جھنجھٹ لکھنوی نے آتے ہی مطلع پر خاص طور پہ داد حاصل کی۔

مرض ہیں سارے جہاں کے لیکن کسی مرض کی دوا نہیں ہے
غریب خانہ ہے یہ ہمارا، کچھ ان کا دار الشفا نہیں ہے

آفتاب لکھنوی کے حسبِ ذیل اشعار خوب پسند کئے گئے۔

وہ رند ہوں یا جناب واعظ بس اک اکھاڑے کے پہلوان ہیں
ہے بزمِ ساقی میں کون ایسا جو پی کے کشتی لڑا نہیں ہے
ہے شیخ جتنا زمیں کے اوپر اسی قدر ہے زمیں کے نیچے
اِدھر بھی کوئی سرا نہیں ہے اُدھر بھی کوئی سرا نہیں ہے

ماچیس لکھنوی کی ہزل سب سے زیادہ کامیاب ہوئی اور ان کے ہر شعر پہ ہنسی اور قہقہے کے ڈونگرے برسے۔

گلی میں اک دن جوان کے دربان کو بدتمیزی پہ میں نے ڈانٹا
ٹنگی ہے اس دن سے ایک تختی کہ "عام یہ راستہ نہیں ہے"
عدو سے پٹوایا خوب پہلے اور اب گلے مل کے رو رہے ہیں
ستم کی بھی انتہا نہیں ہے کرم کی بھی انتہا نہیں ہے
کبھی جو میدانِ عشق چھوڑے کبھی جو لاتوں سے منھ کو موڑے
یہ دل ہے عاشق کا بندہ پرور! بٹیر جاگا ہوا نہیں ہے

جناب عطا حسین عطا کی ہزل پر محفل مشاعرے کا اختتام ۲ ½ بجے شام کے قریب ہوا۔

(قومی آواز لکھنؤ)

۱۷ دسمبر ۱۹۵۷ء

بہترین
تحفہ

ہماری کتابیں
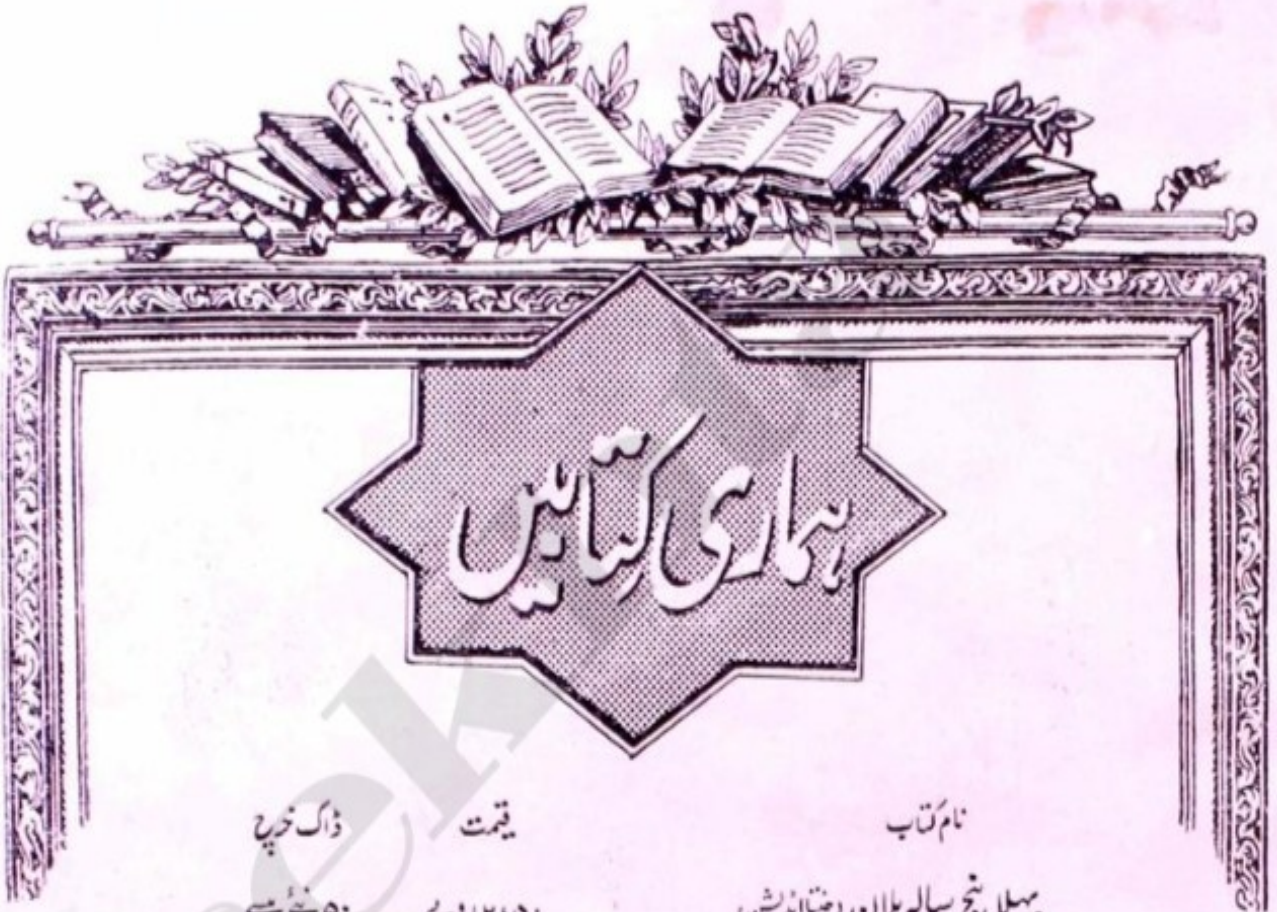
نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنج سالہ پلان (جنتا ایڈیشن)	۲،۵۰ روپے	۵۰ نئے پیسے
آسان پنج سالہ پلان	۵۰ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
زمینی اصلاحات کی ترقی	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
سماجی بہبود	۳۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان	۵ نئے پیسے	۶ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
پنج سالہ پلان ۔ سوالات و جوابات	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
دیہاتی صنعتیں	۳۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے

پچیس روپیہ یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا

قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ اولڈ سکریٹریٹ دہلی

ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے

انگریزی ماہنامے

مارچ آف انڈیا

"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دلچسپ مرقع"
(سنڈے نیوز آف انڈیا)

فی کاپی ایک روپیہ — سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر

کشمیر کی زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دلکش مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہوتا ہے

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے — سالانہ چندہ پانچ روپے

بھاگیرتھ

سینٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن کا سرکاری ترجمان — اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ نئے پیسے — سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیر

سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملک کی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے — سالانہ چندہ پانچ روپے

انگریزی اور ہندی

میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کروکشیتر

اس مصور ماہنامہ کا مقصد کمیونٹی ڈولپمنٹ پروگرام کی اشاعت ہے۔

فی کاپی ۵ نئے پیسے سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیوک

یہ رسالہ کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیوکوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا ہے۔

فی کاپی ۱۰ نئے پیسے —

— سالانہ چندہ ایک روپیہ ۲۰ نئے پیسے

یوجنا (پندرہ روزہ)

چیف ایڈیٹر:- خوشونت سنگھ

اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں اُن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ نئے پیسے

سالانہ چندہ دو روپے پچاس نئے پیسے

ہندی رسالے

آج کل (ہندی)

یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کے سماجی، ثقافتی مسائل اور غیر ملکی معاملات سے متعلق مضامین، کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے —

— سالانہ چندہ چھ روپے

بال بھارتی

ہندی میں بچوں کا باتصویر رسالہ۔ دلچسپ کہانیاں، بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکلے اس میں شامل ہوتے ہیں۔

فی کاپی ۵ نئے پیسے —

— سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان

ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا ترجمان

فی کاپی ۵ نئے پیسے —

— سالانہ چندہ چار روپے

ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں

یا براہِ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی